سن نینی تال



کرشن چندر



کرشن چندر ایم اے

مس نینی تال

کہانی میں پریم ! پریم میں کہانی !

مس نینی تال

کرشن چندر

ایک عظیم رومان

بک کارنر چوک فیصل شہید
بازار کلاں جہلم فون نمبر ۲۸۸۵

کہانیاں

اہتمام ——— شاہد حمید شفیق الرحمٰن

طابع ——— نثار آرٹ پریس لاہور

آرٹ ——— خیال آرٹ سٹوڈیو لاہور

قیمت دس روپے

مینا بازار

دو عاشقوں میں توازن برقرار رکھنا جبکہ دونوں آئی۔سی۔ایس کے افراد ہوں۔ بڑا مشکل کام ہے۔ مگر رمبھا بڑی خوش اسلوبی سے اس کام کو سرانجام دیتی تھی۔ یوں تو ایک کھیپ کی کھیپ اس کے نئے عاشقوں کی اس ہل سٹیشن پر پیدا ہوگئی تھی۔ کیونکہ رمبھا بے حد حسین تھی۔ اس کا پیارا پیارا چہرہ کسی آرٹ میگزین کے سرورق کی طرح جاذبِ نظر۔ اُس سنہری جلد نائیلون کی سطح کی طرح بے داغ اور ملائم اور اس کا نوجوان جسم نئے ماڈل کی گاڑی کی طرح سپرنگ دار نظر آتا تھا۔ دوسری لڑکیوں کو دیکھ کے یہ احساس ہوتا تھا کہ انہیں اُن کے ماں باپ نے شاید اوندھے سیدھے تجربوں کے درمیان پالا ہے لیکن رمبھا کو ضرور کسی ماڈرن کارخانے نے ڈھالا ہے اس کے جسم کے خطوط۔ اُن کے نٹ، بولٹ، کمانی اور سپرنگ اپنی جگہ پر اس قدر درست اور صحیح معلوم ہوتے تھے کہ جی چاہتا تھا کہ رمبھا سے اس کے میکر بلکہ مینوفیکچرز کا نام پوچھ کے اسے دس ہزار ایسی لڑکیاں سپلائی کرنے کا فوراً ٹھیکہ دے دیا جائے۔

حمبار مینجا کی طرح حسین تو نہ تھی۔ لیکن اپنا بوٹا سا قد لئے اس طرح ہوئے ہوئے چلتی تھی جیسے جھیل کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں ایک دوسرے سے اٹھکھیلیاں کرتی جارہی ہوں اس کے جسم کے مختلف حصّے آپس میں مِل کر ایک ایسا حسین تموّج پیدا کرتے تھے جو اپنی فطرت میں کسی وائلین کے نغمے کے مشابہ تھا۔ ہل سٹیشن کی اپر مال روڈ پر جب وہ چہل قدمی کے لئے نکلتی تھی تو لوگ باگ اس کے جسم کے خوابیدہ فتنوں کو دیکھ دیکھ کر مبہوت ہو جاتے تھے۔

زبیدہ کی آواز بڑی خوبصورت تھی۔ اور کسی ہائی فی ریڈیو کی سیٹریوفونک آواز سے مشابہ تھی۔ اسے دیکھ کر کسی عورت کا نہیں کسی گراموفون کمپنی کے ریکارڈ کا خیال آتا تھا۔ وہ ہر وقت مسکراتی رہتی کیونکہ اس کی سانولی رنگت پر اس کے سفید دانت بے حد بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اور جب کبھی قہقہہ مار کر ہنستی تو ایسا معلوم ہوتا۔ گویا ایک ساتھ نازک کانچ کے کئی شمپین گلاس ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو ایسی عورت کے ساتھ کلب میں بیٹھ کر بے پیئے ہی نشہ ہو جاتا ہے۔

مرنالینی کی آنکھیں بڑی اُداس تھیں۔ اور ہونٹ بڑے خوبصورت تھے۔ اُن نگاہوں کی اُداسی ایک مدہم رنگوں والے غالیچے کی طرح ملائم مدہم اور خنک آمیز تھی۔ انہیں دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ زندگی کے پُرپیچ اور خاردار راہوں پر سے گزرتے ہوئے ان سایہ دار پلکوں کے نیچے

چند لمحے آرام و سکون کے گذار دئیے جائیں۔ اُسے دیکھ کر اُس رلیستوان کی یاد آتی تھی۔ جو چانتا پیک جاتے ہوئے راستے میں ملتا ہے، گھنے پیڑوں تلے مدہم روشنیوں والے چھپتے ہوئے برآمدے خاموش مؤدب بیرے اور تازہ مہکتا ہؤا الائم جو بس اس رلیستوان میں بیٹھ کر محبت کے ماروں نے اکثر مرنالنی کو یاد کیا ہے اور مرنالنی کو دیکھ کر اُنہیں اکثر اُس رلیستوان کا خیال آیا ہے۔ بعض عورتیں ایسی ہی خوبصورت ہوتی ہیں۔

روزا گلاب کی طرح تو نہ تھی۔ لیکن تتلی کی طرح ضرور تھی۔ ہر وقت تھرکتی رہتی۔ لیکن مختلف مردوں پر نہیں بلکہ ڈانس ہال میں راک این رول سے ماڈرن ٹوِسٹ تک۔ اسے ہر طرح کے ناچ یاد تھے۔ اُس کا صرف ایک عاشق تھا۔ حالانکہ کئی ہو سکتے تھے۔ مگر دو سالوں سے وہ صرف ایک عاشق پر صبر کئے بیٹھی تھی۔ کیونکہ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ شادی کے لئے صبر کرنا بے حد ضروری ہے۔ چاہے وہ اپنا محبوب ہی کیوں نہ ہو روزا نے پیٹر پر صبر کر لیا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ پیٹر نے ابھی تک صبر نہ کیا تھا۔ کیونکہ پیٹر روزا سے بھی بہتر ڈانسر تھا۔ اور آئی۔ سی ایس کا افسر تھا۔ اور رنڈوا ہو کر بھی کنوارا دُھلا دُھلایا معلوم ہوتا تھا۔ کہ رمبھا ایسی خوبصورت لڑکی بھی اسے لفٹ دینے لگی تھی۔ گو روزا رمبھا کو کسی طرح اپنے سے بہتر سمجھنے پر تیار تھی روزا کا جسم کسی بارہ تیرہ برس کی عمر کے لڑکے کی طرح دُبلا پتلا تھا۔ ایسی ہی اُس کی آواز تھی۔ اور اُس کے لہریئے دار کٹے ہوئے بال

کتنے خوبصورت تھے۔ ان بالوں کو دیکھ کر کسی آرکسٹرا کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ اور سیاہ جینز میں روزا کی لانبی مخروطی ٹانگیں۔ اس کا سارا جسم کسی جیٹ ہوائی جہاز کی طرح نازک خطوط کا حامل تھا۔ رمبھا کون ہوتی ہے پیٹر کو مجھ سے چھین لینے والی؟

ایلا جو کسی زمانے میں مسز کیلا چند تھیں اور اب طلاق حاصل کر چکی تھیں۔ آج بھی اپنے نیپالی حسن سے لوگوں کی نگاہیں خیرہ کیے دیتی تھیں۔ آریائی حسن میں چینی حسن اس طرح گھل مل گیا تھا کہ ان دونوں کی آمیزش سے جو مجسمہ تیار ہوا اس میں بالکل ایک نئی طرح کی پھبن اور بانکپن تھا۔ اس پر ایلا کے کپڑے ساری ہائی سوسائٹی میں مشہور تھے۔ اس کے حسن میں جو خامیاں تھیں۔ ایلا انہیں کپڑوں سے پورا کر لیتی تھی۔ کپڑوں سے اور زیورات سے ایلا کے پاس ایک سے ایک خوبصورت جواہرات کے بڑھیا سیٹ تھے۔ اور آج سے پانچ سال پہلے ایلا نے شملہ اور دارجیلنگ میں ایک سیزن میں دو بیوٹی کمپٹیشن جیتے تھے۔ اور گو کچھ لوگوں کے خیال میں اب وہ پرانے ماڈل کی گاڑی تھی۔ لیکن مسلسل جھاڑ پونچھ احتیاط اور پالش سے اس کی آب و تاب بدستور قائم تھی۔

امپیریل سٹیشن کے چیف کمشنر صاحب کی تین لڑکیاں تھیں۔ جن کے لئے چیف کمشنر صاحب بہادر کو مناسب بروں کی تلاش تھی۔ ان کے نام بالترتیب سدھا، مادھری، اور آشا تھے۔ ان تینوں میں آشا کا

شمار تو کھلے طور پر بدصورتوں میں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ سدھا اور مادھری گو خوبصورت نہ تھیں۔ لیکن نک سک سے درست تھیں مگر چونکہ وہ چیف کمشنر صاحب کی لڑکیاں تھیں اس لیئے ان کا شمار بھی خوبصورت لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کل ہر منسٹر کی تقریر ایک ادبی شاہکار سمجھی جاتی ہے۔

ان کے علاوہ سیتا۔ ملہوترا۔ پرجیس عبدالرحمٰن، ہلبیر کور، پشپا رازدان۔ خورشید گور والا۔ اور بنیجر آنند کی لڑکی گوری۔ وغیرہ وغیرہ بھی اس ہل سٹیشن کے سالانہ بیوٹی کمپی ٹیشن میں شامل تھیں جو ابھی کلب کے لان پر شروع ہونے والا تھا۔ یہ خوبصورتی کا مقابلہ اس ہل سٹیشن کا گویا سب سے بڑا قومی تہوار ہوتا ہے۔ اور اس روز کلب کے لان میں سینکڑوں لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ رنگارنگ جھنڈیاں اور بندھن واریں۔ زرق برق ساڑھیوں میں ملبوس عورتیں اور نیچے اور سنہری بیئر کے سفید کف سے اُبلتے ہوئے جام اور حصّہ لینے والی لڑکیوں کے خوفزدہ کھوکھلے قہقہے اور عاشقوں اور ماں باپوں کی طفل تسلیاں اور آخری منٹ پر بلاوز کی تبدیلی اور ساڑی کا آخری نوک کو تیز کرنا باپ رے! یہ بیوٹی کمپی ٹیشن بھی آئی سی ایس کے کمپی ٹیشن سے کسی طرح کم نہیں ہے اور کچھ ہو نہ ہو اس میں اول نمبر پانے والی لڑکی کو بر تو فوراً مل جاتا ہے۔ اور وہ بھی بہت اونچے درجے کا۔ اس لئے ہر سیزن میں درجنوں لڑکیاں اس میں خوشی خوشی حصّہ لیتی ہیں اور ماں باپ خوشی خوشی سے اجازت بھی دیتے ہیں

آج بیوٹی کمپی ٹیشن کا فائینل تھا۔ اور فائینل کے جج کنور باند اسنگھ روہیل کھنڈ ڈویژن کے سابق چیف کمشنر تھے اور سر سیتا رام جن کے مشاعرے اور کوی سمیلن ہر سال دِلّی میں دھوم مچاتے ہیں۔ کسی طرح یہ سمجھ لیا گیا تھا۔ کہ جو آدمی مشاعرے اور کوی سمیلن کامیاب کرا سکتا ہے۔ وہ عورتوں کو پرکھنے کا بھی ماہر ہو سکتا ہے۔ پھر ایک ممبر سابق جسٹس دیش پانڈے بھی چن لئے گئے تھے۔ تاکہ انصاف کے پلڑے برابر رہیں۔ ایک ممبر سیّد امتیاز حسین بار ایٹ لا تھے۔ جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہر روز اپنی بیوی کو پیٹتے ہیں۔ پانچویں جج کماؤں کے رئیس اعظم دیوان بلراج ساہ تھے۔ جن کے متعلق یہ مشہور تھا کہ ان کی بیوی ہر روز ان کو پیٹتی ہے مقابلے کی کونسل میں ججوں کے لئے دو نام اور پیش کئے گئے تھے۔ ایک تو ہندی کے مشہور کوی کنج بہاری شرما تھے جنہوں نے برج بھاشا میں عورتوں کے حسن پر بڑی سندر کوتائیں لکھی ہیں۔ دوسرے قمر جیولرز کے پروپرائیٹر قمر الدین قریشی تھے جن سے بہتر جواہرات کے زیورات یوپی میں تو کوئی بناتا نہیں۔ مگر یہ دونوں حضرات ووٹنگ میں ہار گئے۔ کسی عورت کو بھی ججوں کی کمیٹی میں نہیں لیا گیا کیونکہ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ ہر عورت اپنے سے زیادہ حسین کسی کو نہیں سمجھتی ہے اور اگر کسی عورت کو ججوں کی کمیٹی میں شامل بھی کیا گیا۔ تو وہ مقابلے میں حصّہ لینے والی سب لڑکیوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل اور خدو خال صفر نمبر دے دیگی۔ لہٰذا شدید بحث و تمحیص کے بعد یہی طے پایا کہ

اس کمیٹی میں کسی عورت کو شامل نہ کیا جائے۔ اور یہی پانچ جج مقابلۂ حسن پر فیصلہ صادر کرنے کے لئے چن لئے گئے۔

دن بڑا چمکیلا تھا۔ آسمان پر اُجلے اُجلے سپید درخشاں بادل گویا براسو پالش سے چمکائے گئے تھے۔ کلب کا لان بڑا خوبصورت تھا بالکل مرزا فنے کی گرین (؟) کا سبز غالیچہ معلوم ہوتا تھا۔ نیچے اس قدر دُھلے دُھلائے اور صاف شفاف نظر آتے تھے۔ گویا پلاسٹک کے بنے ہوئے ہوں۔ وسیع و عریض لان کے کنارے کیاریوں میں سویٹ پی ڈھیلیا لارک سپر۔ پٹیونیا اور کارنیشن کے پھول کچھ اس قاعدے اور ترتیب سے کھلے ہوئے تھے گویا کاغذ سے کاٹ کاٹ کر ٹہنیوں سے چپکائے گئے ہوں۔ غرضیکہ بڑا حسین منظر تھا۔

سب سے پہلے اناؤنسر نے لان کے درمیان کھڑے ہو کر ایک زوردار گھنٹی بجائی اور تین بار اس گھنٹی کو سن کر لوگ باگ جوق در جوق کلب کے مختلف کمروں سے نکل کر باہر لان میں آنے لگے۔ لان میں ایک کنارے نیم دائرے کی شکل میں صوفے اور کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ سب سے آگے صوفے پر پانچ جج بیٹھ گئے۔ اُن کے پیچھے کلب کے سرکردہ ممبر اور رؤسا۔ ان کے بعد خاص خاص شرفا اور پھر عام شرفا۔ سب سے آخر میں لکڑی کے بنچوں پر ہمارے ایسے رزیل اور کمینے آ کے کھڑے ہو گئے۔ اور بات بے بات بلاوجہ ہنسنے لگے۔ آخر میں اناؤنسر کو زوردار گھنٹی بجا کر سب کو چپ کرانا پڑا۔

سب سے پہلے جسٹس دلیش پانڈے نے اُٹھ کر مقابلے کے فائنیل میں آنے والی لڑکیوں کی فہرست پڑھ کر سنائی۔ پھر بینڈ بجنا شروع ہو گیا۔ اور بینڈ کی گت پر سب لوگوں کی نظریں کلب کی سیڑھیوں پر لگ گئیں۔ جہاں اندر کے میک اپ روم سے نکل کر حسینائیں سیڑھیاں اُتر کر کلب کے لان پر ججوں کے سامنے آنے والی تھیں۔ سیڑھیوں سے لے کر ججوں کے سامنے تک ایک لمبا سُرخ غالیچہ بچھا دیا گیا تھا۔ جس پر چل کر مقابلے میں حصہ لینے والیاں اپنی اپنی ادائیں کرشمے۔ عشوے یا نخرے دکھانے والی تھیں بہت سے لوگوں نے اپنی دور بین نکال لیں۔ حالانکہ ساڑی کے اندر سے کیا نظر آسکتا ہے۔

سب سے پہلے ایلا گہرے سُرخ رنگ کی چندیری ساڑھی سنبھالتی ہوئی، مٹکتی ہوئی، سو سو بل کھاتی ہو سیڑھیوں سے نیچے اُتریں خوشبوؤں کے بھبکے دور دور تک پھیل گئے۔ ایلا کے چہرے پر ایک عجیب فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی۔ ججوں کے سامنے رُک کر اس نے اپنا منہ موڑ کر سب کو اپنا کٹیلا رُخ دکھایا اور ان کے کانوں میں جھکتے ہوئے یاقوت کے آویزے نگاہوں میں لرز لرز گئے۔ پھر وہ اپنا گورا گداز ہاتھ آگے بڑھا کر سیب کی ڈالی کی طرح لچا کر کچھ اس ادا سے اپنی ساڑی کے پلّو کو سنبھال کر پلٹیں کہ تماشائیوں کے دلوں میں موج در موج لہریں

ڈولتی چلی گئیں۔

زبیدہ ایک مغل شہزادی کے روپ میں نمودار ہوئیں۔ گہرے جامنی رنگ کا کامدانی غرارہ۔ اُس کے اوپر ہلکے اودے رنگ کے لکھنو چکن کی باریک پھولدار قمیض۔ اُس کے اوپر لہریئے دار چنا ہوا ڈوپٹہ اُس کے اوپر زبیدہ کی گردن۔ وہ مشہور صراحی دار گردن۔ جسے دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ اسے اُلٹ کر اس کی ساری شراب پی لی جائے اُس گردن کے گرد اس وقت جڑاؤ زمرد کا گلوبند چمک رہا تھا۔ اور اس کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا اس گردن کے اوپر زبیدہ کا سانولا سلونا پیارا سا چہرہ۔ زبیدہ بڑی تمکنت سے چلتے چلتے ججوں کے سامنے آئی۔ گردن اٹھا کر اُس نے اپنی صراحی کے خم کو واضح کیا اور یکایک ہنس پڑی اور اُس کے سپید سپید دانتوں کی لڑی بجلی کی طرح کوند گئی۔

روزا گہرے سبز رنگ کی تنگ جینز کے اوپر یسمین رنگ کا چینٹا ہوا ابلاؤز پہن کر جو آئی تو اس کے سینے کا اُبھار۔ اس کی کمر کا خم۔ اس کی لانبی مخروطی ٹانگوں کی دل کشی اور رعنائی ہر قدم پر یوں واضح ہوتی گئی کہ بہت سے فوٹوگرافر تصویر لینے لگے۔ اور تماشائی واہ واہ کہہ کر سیٹیاں بجا کر داد دینے لگے۔ مسکراتی ہوئی روزا نے گردن کو ذرا سا جھکا کر سب تماشائیوں سے دادِ تحسین وصول کی۔ اور چلی گئی۔

پھر سُدھا مہتہ آئیں اور اُن کے بعد مادھری مہتہ دونوں بس ٹھیک تھیں۔ نہ اچھی نہ بُری۔ مگر چونکہ چیف کمشنر صاحب کی لڑکیاں تھیں اس لئے آگے بیٹھنے والے صاحبِ اقتدار لوگوں نے ان بچوں کا دل رکھنے کے لئے زور زور سے تالیاں پیٹیں۔ مگر اُن کے بعد آشا مہتہ جو نکلیں تو کسی میں تالی پیٹنے کی ہمت ہی نہ ہوئی ایسی صاف کھری بدصورت تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ میک اَپ بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا ہے۔ بارے وہ بھی مٹکتی ہوئی چلی گئیں۔ اور تماشائیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ستیا ملہوترا شُتر کے رنگ کی باریک بنارسی ساڑی پہنے ہوئے آئیں۔ بنارسی ساڑی کے نیچے کا پیٹی کوٹ بہت عمدہ تھا۔ پیٹی کوٹ بھی اگر نائیلون کا ہوتا تو ممکن ہے کچھ نمبر بڑھ جاتے۔

مرنالنی نے دیوداسیوں کی طرح بال اوپر باندھ کر شیونتی کے پھولوں سے سجائے ہوئے تھے۔ اس نے کوئی میک اَپ نہیں کیا تھا۔ سوائے کاجل کی ایک گہری لکیر کے جس نے اس کی بڑی بڑی بڑی آنکھوں کی اُداسی اور اتھاہ غم کو اور اُبھار دیا تھا۔ ججوں کے قریب آکر اُس نے کچھ اس انداز سے ان کی طرف دیکھا جیسے وحشی ہرنی شہر میں آکے کھو گئی ہو۔ یا جمنا دیوداس کے لئے رو رہی ہو پھر وہ چلی گئی۔

اس کے بعد جمنا، برجیس، خورشید، گوری وغیرہ ایک ایک کر کے

باہر نکلیں اور اپنی اپنی ادائیں دکھا کر رخصت ہوتی گئیں۔ سب سے آخر میں رمبھا نکلی اور اس کے نکلتے ہی بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔ اور تماشائیوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ رمبھا نے چست پنجابی قمیض اور شلوار پہن رکھی تھی اور یہ لباس اس کے جسم پر اس قدر چست تھا۔ کہ بالکل تیراکی کا لباس معلوم ہوتا تھا۔ اس لباس میں رمبھا کے جسم کا ایک ایک خم نمایاں تھا۔ اور جب وہ چلتی تھی تو اس کے ٹخنوں پر اُلجھتی ہوئی حجا مخنوں کے چھوٹے چھوٹے گھنگھرو ایک روپہلی صدا پیدا کرتے جلتے تھے اُسے دیکھ کر تماشائیوں کے گلوں سے بے اختیار واہ واہ کی صدا نکلی۔ چاروں طرف سے تحسین و مرحبا کا دونگڑا برس گیا۔ اب اُس میں تو کسی کو کوئی کلام نہیں تھا۔ کہ اس سال کی ملکۂ حسن رمبھا ہی چنی جائے گی۔

جب سب لڑکیاں چلی گئیں تو جج بھی اُٹھ کر کلب کے اندر ایک کمرے میں مشورہ کرنے کے لئے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد تماشائیوں کا شوق انتہا کو پہنچ گیا۔ لوگ زور زور سے باتیں کرنے لگے کوئی کسی کو نمبر دیتا تھا۔ کوئی کسی کو ہر عاشق اپنی محبوبہ کے گرد ہالہ کھینچ رہا تھا۔ ہر ماں اپنی بیٹی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی تھی۔ مگر اکثریت رمبھا کے حسن میں تھی۔ البتہ دوسرے اور تیسرے نمبر پر مختلف لڑکیوں کے نام لئے جا رہے تھے۔

کوئی جھرنا کا نام لیتا۔ کوئی زبیدہ کا۔ کوئی برجیس کا۔ کوئی ستیا ملہوترا پر مرمٹا تھا۔

پندرہ منٹ کے بعد جج اپنے کمرے سے نمودار ہوئے۔ جج دلیش پانڈے کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ تھا۔ جج دلیش پانڈے فیصلہ سنانے کے لئے اُٹھے تو سارا مجمع ایک دم خاموش ہو گیا۔

جسٹس دلیش پانڈے نے اپنی عینک ٹھیک کی۔ اپنا گلا کھنکھار کے صاف کیا۔ پھر کاغذ کے پرزے کو اپنی ناک کے قریب لا کر اونچی آواز میں کہا۔

"ججوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس سال کے بیوٹی کمپی ٹیشن میں اوّل نمبر پر آنے اور ملکہ حسن کہلانے کی حقدار مس سدھا مہتہ ہیں۔"

نمبر دو مس مادھری مہتہ

نمبر تین مس زبیدہ

چیف کمشنر مہتہ کے گھر میں اک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ آشا مہتہ نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ شام کو جب چیف کمشنر صاحب کلب سے گھر لوٹے تو آتے ہی ان کی بیوی نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔

"ہائے میری بچی" دوپہر سے رو رہی ہے۔ ہائے تم نے آشا کا بالکل خیال نہیں کیا۔ ہائے آگ لگے تمہارے چیف کمشنر ہونے پر کیا فائدہ ہے تمہاری چیف کمشنری کا۔ جب میری بچی" انعام حاصل

نہیں کر سکی ۔ ارے سدھا اور مادُھری کو تو پھر بھی بر مل جائیں گے لیکن حسین بچی کو تم نے خیال کرنا تھا اُس کا نہ کیا ۔ ارے ہائے ہائے ہائے ، ہائے ۔

چیف کمشنر صاحب نے گرج کر کہا ۔ باؤلی ہوئی ہو ۔ تمہاری دو بچیوں کو تو میں نے انعام دلوا دیا کسی نہ کسی طرح سے ۔ اب تیسری بچی کو بھی انعام دلواتا تو لوگ کیا کہتے ۔ آخر انصاف بھی تو کوئی چیز ہے



لاج

پریم کمار نے پریم تو بہت سے کئے تھے۔ لیکن شادی آج تک کسی سے نہیں کی تھی۔ مگر وہ بے وفا نہیں تھا۔ ہر بار جب اس نے کسی لڑکی سے پریم کیا۔ سچا پریم سمجھ کر ہی کیا۔ رب بہ الگ بات ہے کہ اپنی چالیس برس کی زندگی میں اس نے اتنی بار سچا پریم کیا تھا کہ اب وہ ان کی گنتی بھی بھول چکا تھا) ــــ لیکن یہ سچا پریم ہر بار جھوٹا پریم ثابت ہوا۔ اس میں غلطی نہ پریم کمار کی تھی نہ لڑکی کی۔ مگر ہر بار پریم کمار کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے جسم سے جسم تو ملے لیکن رُوح سدا پیاسی رہی۔ کچھ ایسا لگا جیسے روح سے روح نہیں ملی۔ آتما۔ آتما کی ساتھی نہیں بن سکی (کوئی اس بھلے مانس سے پوچھے کہ جب رُوح سے روح نہیں ملی تو تمہیں جسم سے جسم ملانے کا کیا حق تھا۔؟) لیکن پریم کمار ایک کامیاب ہیرو تھا۔ صفِ اول کا ہیرو تھا۔ ہر سال لاکھوں روپے کماتا تھا۔ اور کروڑوں لوگوں کے دلوں کا دیوتا تھا۔ ایسے دیوتا سے کوئی کیسے پوچھے؟ کہ مسٹر پریم کمار تم جو ہر سال دس لڑکیوں سے عشق کرتے ہو اور ہر موسم کے

بدملنے پر اپنی لڑکی بدل لیتے ہو اور لڑکی کا دل یوں توڑ دیتے ہو جیسے عمدہ ڈنر کھانے کے بعد لکڑی کا خلال توڑ دیا جاتا ہے۔ تو صاحب یہ تمہاری محبت ہے کہ ہوس؟ مگر دیوتاؤں سے اور نیتاؤں سے اور دھن والوں سے ایسی باتیں کون پوچھ سکتا ہے؟

اس لیئے چالیس سال تک پریم کمار سچا پریم کرتا رہا اور لڑکیاں بدلتا رہا اور کامیابی کے زینے پر چڑھتا رہا اور فلموں میں کام کرتا رہا اور دنیا کی سیر کرتا رہا اور جہاں جاتا رہا سچا عشق کرتا رہا اور عشق کرتے کرتے چالیس برس کا ہو گیا۔ لیکن اُسے اپنی پسند کی لڑکی نہیں ملی۔ ایسی لڑکی جس کی روح اس کی روح سے میل کھاتی ہو۔ ہاں اُسے جسم بہت ملے درجنوں بلکہ سینکڑوں جسم۔ نوجوان اور خوبصورت جسم، بھولی مسکراہٹوں اور الھڑ اداؤں والے جسم۔ من موہنے حسین دلکش جسم۔ اور اس کی کوئی شب جسم کے بغیر خالی نہ گئی۔ مگر اس کی رُوح سدا پیاسی اور خالی رہی اور وہ اپنے ساتھی کی تلاش میں ڈھونڈتا ڈھونڈتا چالیس برس کا ہو گیا لیکن اُسے اپنی روح کا ساتھی نہ ملا۔ لوگ اُسے خوش قسمت سمجھتے تھے لیکن یہ اس کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ کتنا بدنصیب ہے، بنیک میں تیس لاکھ رکھنے کے بعد بھی کتنا بدنصیب ہے۔ ہر روز ایک بوتل وسکی کی پینے کے باوجود کتنا بدنصیب ہے ہر روز ایک نئی لڑکی کے ساتھ سونے کے باوجود کتنا بدنصیب ہے؟

بعض لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں پریم کمار کو دیکھ کر مجھے اکثر

اس پر بڑا رحم آتا تھا اور اس پر ترس کھا کر کئی بار میں نے سوچا ہے کاش پریم کمار کی بدنصیبی مجھے مل جاتی اور میری خوش قسمتی اُسے !۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے ؟ میں پریم کمار کا دوست ہوں اسکول کے دنوں سے اس کا دوست ہوں ۔ مگر ایک دوست بھی اپنی زندگی دوسرے دوست کو نہیں دے سکتا ۔ حالانکہ ایک دن میں نے اس کا ارادہ بھی کرلیا تھا ۔ اور اپنی خوش قسمتی اور اس کی بدنصیبی کا خیال کرتے ہوئے اس سے کہہ دیا تھا "دوست اگر تم چاہو ۔ تو تم میری زندگی لے سکتے ہو ۔ میری بھینگی بیوی اور اس کے سات بچّے لے سکتے ہو ۔ میری کھولی معہ دو معہ دو ٹوٹی ہوئی چار پائیوں ۔ تین بستر اور دو زنگ آلود ڈرم لے سکتے ہو ۔ ساڑھے پانچ ہزار کا قرض جو مجھ پر واجب ہے وہ بھی لے سکتے ہو، اور تھرڈ کلاس لوکل ریلوے کا پاس بھی جو میں ہر ماہ بنواتا ہوں اور جس کے سہارے میں فٹ بورڈ پر لٹکے باندرہ سے چرچ گیٹ تک جاتا ہوں تم وہ بھی لے سکتے ہو ! دوست مگر تمہاری بدنصیبی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ۔ روز رات کو وسکی کی بوتل کھول کر جس طرح تم بلک بلک کر عورت کی روح کے لئے روتے ہو وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا ! تم بتاؤ تباؤ میں کیا کروں ؟ جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب تم لے سکتے ہو !

پریم کمار نے میری فراخ دلی سے متاثر ہو کر فوراً مجھے گلے سے لگالیا اور سسک سسک کر بولا ۔ دوست ہو تو ایسا ہو ؟ تمہارا لاکھ لاکھ شکریہ مگر دوست کون کسی کے نصیب سے اپنا نصیب بدل سکا ہے ؟

جس روح کی سچّی محبت کی مجھے تلاش ہے وہ اگر خود سے مجھے نہ مل سکی تو تمہارے سہارے کیا ملے گی۔؟ اور جہاں تک تمہاری عورت کا تعلق ہے میں اپنی بھابھی کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ لیکن اس بیچاری کے منہ میں دانت تک تو رہے نہیں روح کیا رہے گی! ۔ میں تمہارے بچّے بھی تم سے نہیں چھین سکتا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے تمہیں اپنے بچوں سے کتنا عشق ہے۔ تمہاری کھولی بھی تم سے نہیں چھینوں گا ورنہ تمہیں فٹ پاتھ پر رہنے سے بڑی تکلیف ہوگی۔ اور میں اپنے کسی دوست کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارا قرضہ بھی نہیں لوں گا ورنہ تم اور قرضہ چڑھا لوگے۔ اور یہ تم سے دوستی نہیں دشمنی ہوگی۔ تمہارا تھرڈ کلاس کا پاس بھی نہ لوں گا ورنہ تم بلا ٹکٹ پکڑے جاؤگے۔ غرضیکہ دوست کس طرح ہم سے ہم دونوں اپنی زندگیاں نہیں بدل سکتے۔ مگر تم زیادہ غم نہ کرو میں اب چالیس برس کا ہو چکا ہوں۔ اب میں زیادہ دیر تک اپنی بدنصیبی کی صلیب اکیلے نہ اُٹھا سکوں گا۔!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب میں بہت جلد شادی کر لوں گا یہ میں نے طے کر لیا ہے"

"کس سے؟"

"یہ تو طے نہیں کیا ہے!"

"پھر بھی نظر میں تو کوئی ہوگی!"

"فی الحال میری نظر میں دو لڑکیاں ہیں اور دونوں میری دو مختلف فلموں

فلموں میں ہیروئن کا کام کر رہی ہیں۔ اور فی الحال میں دونوں سے محبت کر رہا ہوں!،،

،، دونوں سے ؟ وہ کیوں ؟،،

،، وہ اس لئے کہ کیا معلوم اُن دونوں میں سے کس کی آتما میری آتما سے مِل جائے ؟ اس لئے احتیاطاً دونوں سے محبت کر رہا ہوں۔ اور اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اب اپنی زندگی میں زیادہ دیر تک بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ اور اب میری تلاش ان دونوں لڑکیوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یقیناً ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی ضرور ایسی ہوگی جو میری روح کی ساتھی ہوگی ! ہولی کے دن مجھے پتہ چل جائے گا۔

ہولی کے دن اُس نے بہت سے فلمی ستاروں کو باندرہ ہل کی اپنی شاندار کوٹھی میں مدعو کیا تھا۔ دلیپ کمار۔ راجکپور۔ شمی کپور راجیندر کمار۔ بھارت بھوشن۔ دیو آنند۔ سادھنا۔ آشا پارکھ۔ سائرہ بانو۔ حسین جلیل، وحیدہ رحمان۔ جے راج۔ ڈیوڈ۔ کے این سنگھ پران، اوم پرکاش۔ جانی واکر سبھی فلمی ستارے اس لئے بلائے گئے تھے کہ کئی سال سے یہ روایت بن چکی تھی کہ ہولی کے دن سب لوگ اس کے گھر اکٹھے ہوتے تھے کیونکہ اس کی کوٹھی کا سوئمنگ پول بہت شاندار اور بہت بڑا تھا اور زیرِ آب رنگا رنگ روشنیوں سے اس طرح جھلملاتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سوئمنگ پول کے پانی میں

دھنک کے ساتوں رنگ بکھر گئے ہیں۔ اس سوئمنگ پول میں خفیہ ٹونٹیاں لگوائی گئی تھیں جن سے بوقت ضرورت طرح طرح کے رنگ والے پانی تالاب میں چھوڑے جا سکتے تھے۔ گلابی، سبز نیلا۔ پیلا۔ جامنی۔ نارنجی، رنگوں کے پانی چاروں سمتوں سے اندر کی ٹونٹیوں سے فوارے کی طرح زور سے نکل کر جب تالاب میں آکر ملتے تو رنگوں کی کہکشاں سی بن جاتی۔ ہولی کے دن اس تالاب میں سب کو نہلایا جاتا تھا۔ اور جو نہلنے پر تیار نہیں ہوتا تھا اُسے زبردستی تالاب میں پھینک دیا جاتا تھا پھر بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوتا۔ تالیاں بجتیں۔ ڈھول پیٹے جاتے اور آئی ایس۔ جوہر۔ مکری اور ادم پرکاش مِل کر بھانگڑا شروع کرتے جس میں ہوتے ہوتے سارے فلم اسٹار شامل ہو جاتے۔

آج ہولی کی تقریب میں پریم کمار نے آرتی بالا، اور ارادھنا دونوں کو بُلایا تھا۔ آج کل وہ ان دونوں سے محبت کر رہا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کر لے گا۔ مگر ابھی وہ ذہنی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ کس سے شادی کرے۔

کبھی تو اسے آرتی بالا بہت پسند آئی۔ کیونکہ آرتی بالا بہت ہی ہنس مکھ، شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ بہت باتونی۔ ہر دم مذاق کرنے والی، قہقہے لگانے والی اور خوش رہنے والی اور چھیڑ چھاڑ کرنے والی

وہ کبھی خاموش نہیں بیٹھتی تھی۔ اگر شوٹنگ نہیں ہے، تو سیر ہے، پکنک ہے، سینما ہے، دعوت ہے، کسی کے ہاں کھانا ہے یا کسی کو اپنے ہاں کھلانا ہے، یا کوئی دوسرا پروگرام ہے قوالی یا تھیٹر ہے اسے ہر دم کوئی نہ کوئی مشغولیت چاہیئے۔ وہ چپ چاپ رہنے والے بور لوگوں کو قطعی پسند نہیں کرتی تھی۔ اگر پریم کمار کبھی سنجیدہ اور خاموش نظر آتا تو فوراً اُسے گدگدانے لگتی۔ اس پر تکیہ، تاش، جوتا، قلم، جراب، تولیہ کتاب جو سامنے آجائے پھینکنا شروع کرتی۔ یا تو اُسے ہنسا دیتی یا خفا کر دیتی۔ اور خفا کر کے تو بہت ہی خوش ہوتی۔ کیونکہ جھگڑے میں اُسے بڑا مزا آتا تھا۔ جھگڑا کر کے وہ بہت ہی انٹ سنٹ باتیں پریم کمار کو سنا دیتی تھی، روٹھ جاتی تھی، روتی تھی اور بڑی مشکل سے منائی جاتی تھی۔ اسے روٹھ کر من جانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ وہ تین لاکھ کی ایکٹرلس تھی حالانکہ اس کی عمر صرف بائیس سال کی تھی۔

لیکن پریم کمار کو ارادھنا بہت ہی پسند تھی۔ ایک تو اس کی عمر بھی کم تھی مشکل سے سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ مگر اٹھارہ برس کی عمر میں بھی جوانی گھٹا بن کر ارادھنا پر برسی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جوانی سے ارادھنا کا انگ انگ ٹوٹا جا رہا ہو۔ پریم کمار کو ایسا محسوس ہوتا کہ اگر اس نے ارادھنا کو ہاتھ لگایا تو وہ بکھر کر ٹوٹ جائے گی۔ اس کی جوانی اس کے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی وہ زیادہ بات تو نہیں کرتی تھی لیکن اس کا جسم بہت بولتا تھا اور اس کی آنکھیں بہت بھولی تھیں

اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں انگاروں کی سی آنچ تھی۔ ارادھنا بولتی کم تھی۔ مگر کھینچتی بہت زیادہ تھی۔ اس کی کشش ایک مقناطیس کی طرح تھی اور جب پریم کمار اس کے ساتھ سیٹ پر کام کرتا تو ساری دنیا کو بھول جاتا۔ اسے معلوم ہوتا کہ اس بانہوں میں کوئی عورت نہیں نہیں ہے سُلگتا ہوُا ایک انگارہ ہے جس سے اس کا سارا بدن جل جائے گا۔

پریم کمار آرادھنا اور آرتی ان دونوں کے بیچ میں لٹک رہا تھا۔ اور فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ کس سے شادی کرے دونوں لڑکیاں ہیروئن تھیں اٹھتی ہوئی اور شہرت کی اونچی منزلوں کی جانب رواں دواں۔ خود پریم کمار کی عمر چالیس سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس لئے اب وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اُسے اپنے مستقبل کی خاطر کسی نوجوان ہیروئن سے جلد شادی کر لینی چاہیئے۔ اب وہ اس انڈسٹری سے تین چار سال سے زیادہ نما لیاً نہیں چل سکے گا۔ اس لئے گھر میں کوئی تو ہو جو اس کے بجائے فلم انڈسٹری میں چل سکے۔ ورنہ گھر کیسے چلے گا۔؟۔ اس طرح کے خیال اب اُسے ستانے لگے تھے۔ اگر وہ چاہتا تو کسی پکّی عمر کی پکے ہوئے پھل کی طرح رسدار ہیروئن سے شادی کر سکتا تھا۔ مگر وہ بھی دو چار سال چل کر رہ جائے گی۔ اس لئے زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ وہ کسی نوعمر ہیروئن سے شادی کرے جسے انڈسٹری سے باہر جاتے ہوئے کم از کم دس بارہ سال تو لگیں۔ اس سے آگے کی بھگوان جانے۔!

اس لئے پریم کمار، ارادھنا اور آرتی بالا کے بیچ میں لٹک رہا تھا اور اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے کس سے سچی محبت ہے۔ ارادھنا سے یا آرتی بالا سے؟ مگر اب وہ اپنی عمر کی اُس خطرناک منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں اسے بہت جلد اپنی محبت کا فیصلہ کر دینا ہوگا اور ان دونوں میں سے ایک سے شادی کر لینی ہوگی۔ آج ہولی کے دن اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔

سوئمنگ پول کے چاروں طرف بے حد شور تھا۔ کچھ لوگ بھنگ پی کر لال پیلے مدہوش تھے اوم پرکاش کہہ رہا تھا۔ میں ایک سو روپے کی بلائنڈ چلتا ہوں!

کے این سنگھ بولا "میں اپنی دونوں آنکھوں سے بلائنڈ چلتا ہوں!

مکری نے کہا "میں ایک آنے کی بلائنڈ چلتا ہوں!

اوم پرکاش نے پوچھا "ایک آنہ ایک سو روپے کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟

مکری بولا "ہو سکتا ہے اگر ہم سب لوگ ایمانداری سے ٹیکس دینے لگیں تو ایک آنہ ایک سو کے برابر ہو سکتا ہے۔"

اس پر شمی کپور نے وحیدہ رحمان اور سادھنا کو پانی میں غوطہ دے دیا اور سوئمنگ پول کے کنارے راکی اینڈ بوائز کا بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔ یہ روائیت تھی کہ جب کبھی کوئی فلم ہیروئن پانی میں گرائی جاتی تھی تو کنارے پر بینڈ زور زور سے بجتا تھا اور لوگ

پانی میں تیرتی ہوئی ہیٹر وئن کی طرف پھول گجرے اور ہار پھینکتے تھے
پھر پران نے جبیں اور شیاما کو دھکا دیدیا اور بینڈ زور زور سے بجنے لگا۔
چند منٹ میں بیشتر فلمی ستارے پانی میں کود گئے اور سوئمنگ پول
کی ٹونٹیوں سے طرح طرح کے پانیوں کے فوارے پھوٹنے لگے اور وہ
لوگ جھلملاتی ہوئی رنگین روشنیوں میں نہاتے ہوئے ایک دوسرے
پر پانی پھینکتے ہوئے ہنستے ہوئے قہقہے لگاتے ہوئے ہولی کی پھاروں
میں کھو گئے۔

اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ ڈائیونگ بورڈ پر پریم کمار آرتی بالا
کو لئے کھڑا ہے اور ہاتھ کے اشارے سے بینڈ کو دُھن چھیڑنے
کے لئے کہہ رہے۔

آرتی بالا نے ایک لمحے کے لئے کسی طرح کی حجّت نہیں کی۔ وہ
مسکراتے ہوئے پریم کمار کے شانے پر ہات رکھے ہوئے ڈائیونگ
بورڈ پر آئی اُس نے ہلکے جامنی رنگ کا ایک پھولدار بکنی سوٹ پہن
رکھا تھا۔ اور وہ بار بار اپنی کمر کو لچکاتے ہوئے اٹھلا رہی تھی ۔
باتیں کرتے کرتے یکایک پریم کمار نے اسے دھکا دیا اور لوگوں کے
شور کے درمیان آرتی بالا ایک ابابیل کی طرح بازو پھیلائے ہوا میں
اُڑتی نظر آئی اور دوسرے لمحے میں مدہم سے پانی میں کود گئی۔

چند منٹ کے بعد پریم کمار ڈائیونگ بورڈ سے غائب ہو گیا
حالانکہ پانی کی سطح سے ہاتھ پھیلا پھیلا کر آرتی بالا اسے نیچے ڈائیو-

کرنے کو کہہ رہی تھی۔ گویا اسے اپنے آغوش میں اُترنے کو کہہ رہی تھی مگر پریم کمار اب ارادھنا کو پانی میں گرانے کی فکر میں بہت اور سوئمنگ پول چھوڑ کر ارادھنا کو ڈھونڈھنے کے لئے چلا گیا بہت اُسے دیکھ کر ارادھنا اسی کے گھر کے ایک کمرے میں چھپ گئی تھی۔ کیونکہ وہ سوئمنگ پول میں نہانا نہیں چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے پریم کمار نے اُسے ڈھونڈا مگر ارادھنا کسی طرح تیار نہ ہوئی۔

"گھبراتی کیوں ہو؟" پریم کمار نے کہا تمہارا جسم تو سب سے خوبصورت ہے چلو سوئمنگ پول میں مرد دیکھتے ہی مر جائیں گے۔ عورتیں جل جائیں گی۔"

"نہیں مجھے شرم آتی ہے" ارادھنا گھبرا کر بولی۔

"ہولی کے دن شرم کیسی؟" پریم کمار نے پوچھا۔

"مجھے تیرنا نہیں آتا۔" ارادھنا نے دوسرا بہانہ کیا۔

"میں تمہیں پانی میں سنبھالے رہوں گا۔" پریم کمار نے وعدہ کیا۔ ۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔

"چلو۔" پریم کمار ارادھنا کو سوئمنگ پول کی طرف گھسیٹنے لگا۔ "نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" ارادھنا برابر ناں کرتی رہی اور پریم کمار اسے زبردستی سوئمنگ پول کی طرف لے جاتا رہا۔ اسی کش مکش میں ارادھنا کا بلاوز پھٹ گیا اور اس کا جوڑا کھل گیا اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

یکایک پریم کمار کو اس پر رحم آگیا۔ اُس نے یکایک اپنا ہاتھ روک دیا۔ ارادھنا کو چھوڑ دیا۔ ارادھنا سکڑی، سمٹی لجاتی خوفزدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور رُک رُک کر بولی۔ ”جانے کیوں مجھے لاج آتی ہے پریم مجھے وہاں مت لے جاؤ!“

پریم نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں لے کر پیار کیا۔ اس کے آنسو پونچھے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ڈائیونگ بورڈ پر لے گیا اور چلا کر کہنے لگا۔

”لیڈیز اینڈ جنٹلمین میری ہونے والی بیوی کو دیکھو!

چند لمحے تو حیرت کا مکمل سکوت رہا۔ پھر سوئمنگ پول میں اس غضب کا طوفان آیا گویا سوئمنگ پول کا سارا پانی اُچھل کر تالاب کے باہر آجائے گا۔!

جب میں نے رات کو پریم سے پوچھا۔ ”تم نے یہ فیصلہ کیسے کیا۔ تو وہ بولا۔ ” ارادھنا اور آرتی بالا میں سے ارادھنا کی رُوح زیادہ شرمیلی ہے۔ وہ فلم اسٹار ہو کر بھی لوگوں کی نظروں سے بچنا چاہتی ہے اُس کی روح کے اندر ایک شریف عورت کی پاکیزگی ہے۔ یقیناً ارادھنا ہی میری سچی محبت کے لائق ہے، میں اس سے شادی کر رہا ہوں۔!

اُسی رات آرادھنا نے اپنے بھائی سے جو دراصل اس کا شوہر

تھا - میں پریم کمار سے شادی کر رہی ہوں !" ۔ تمہیں ایک لاکھ دے کر الگ کر رہی ہوں - تم شادی کے بعد فوراً یہاں سے چلے جاؤ گے - اور پھر کبھی یہاں نہیں آؤ گے !"

" ایک لاکھ دیدو - میری رانی - میں تو کل ہی چلا جاتا ہوں !"

" کل نہیں شادی کے بعد !"

" مگر اب شادی میں میری کیا ضرورت ؟"

" واہ ، شادی کے دن بھائی کی ضرورت ہو گی - ماں باپ تو ہیں نہیں میرے - تم میرے بھائی بن کر میرا کنیا دان نہیں کرو گے تو مجھے بڑی لاج آئے گی -"



جنس گراں

رگھو بھائی کے ارد گرد ہر چیز بڑی تھی۔ نہ صرف اس کا جسم بڑا تھا۔ اس کا دل بھی بڑا تھا۔ اس کی عقل بھی بڑی تھی۔ اس کا بینک بیلنس بھی بڑا تھا۔ (بڑے بینک بیلنس کا بڑی عقل سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے یہ سب جانتے ہیں)، وہ بڑے بڑے ڈسٹری بیوٹروں سے بزنس کرتا تھا۔ بڑی بڑی پکچریں بناتا تھا۔ بڑے بڑے سِتار اپنی فلموں میں لیتا تھا اور رات کو وسکی کے چھ بڑے پیگ پی کر سو جاتا تھا۔

رگھو بھائی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا وہ اپنے چھ فٹ کے لمبے موٹے بڑے جسم سے دیوزاد معلوم ہوتا تھا وہ ایک جہاز کی طرح چلتا تھا۔ سمندر کی طرح ہنستا تھا۔ اور مائیکروفون کی طرح بولتا تھا۔ وہ ایک بڑا آدمی تھا۔

ایک دن اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولا۔

" منشی جی ! "

" جی ! " میں نے کہا۔

" مجھے ایک بڑی کہانی چاہیئے ! " وہ بولا

" مدراس کی فلموں کی طرح لمبی ؟ " میں نے پوچھا۔

" لمبی نہیں بڑی ۔!

میں نے کہا۔ " بڑی کہانی تو بڑے موضوع سے بنتی ہے۔"

" وضو کی بات کون کرتا ہے ؟ وہ خفا ہو کر بولا۔ " وضو تو نماز کے ٹائم پر ہوتا ہے۔ میں کہانی کی بات بولتا ہوں۔ تم وضو کی بات کرتا ہے۔ تم بھی ایک دم ایڈیٹ۔ منشی جی!

" بجا ارشاد فرمایا آپ نے سر جھکا کے اقرار کیا۔

" ارشاد اور شمشاد دونوں کو ہم نے نوی فلم کے لئے سائن کر لیا ہے۔ کل تک پریم بالا اور طاہرہ بانو کا معاملہ بھی پٹ جائے گا! "

" چار بڑی ہیروئن ؟ " میں نے حیرت سے پوچھا۔

" ہاں ۔ ہم اپنی نئی پکچر میں چار بڑی ہیروئن لے رہا ہے چار بڑے ہیرو۔ ٹاپ موسٹ ہیرو۔ عندلیب کمار، کاجج کا فور سے برجیندر کمار اور اکشے آنند !"

تو چار بڑے ولین بھی لینا پڑیں گے آپ کو ! میں نے کہا۔ ہر ہیروئن کے لئے ایک ولین کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ بیچاری مصیبت میں نہیں پھنس سکتی ۔ اور اگر ہیروئن مصیبت میں نہ پھنسے تو ہیرو فلم میں کام کیا کرے گا؟

" منشی جی! رگھو بھائی میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

" جی سرکار!" میں نے کہا۔

" تم ایکدم بدھو ہو!"، وہ بولا۔

" آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ میں نے آداب کرتے ہوئے کہا۔

" ہم ذرہ نواز کو ویلن نہیں لیں گے!" رگھو بھائی غصے سے بولا اس پکچر میں ہم کسی کو ویلن نہیں لیں گے نہ ذرہ نواز کو نہ پران کو نہ تیواری کو نہ محمد بھائی کو۔ اس پکچر میں ہر ہیرو دوسرے ہیرو کے لئے ویلن کا کام کرے گا۔ عندلیب کمار۔ کاج کافور کے لئے۔ کاج کافور برجیندر کمار کے لئے، برجیندر کمار اکشے آنند کے لئے۔"

" کیا آئیڈیا ہے؟ کیا آئیڈیا ہے۔ میں نے رگھو بھائی کے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔ ایک ہیرو دوسرے کا ویلن! ایسا آئیڈیا آج تک کسی فلم میں نہیں آیا۔ کمال ہے، کمال ہے۔ رگھو بھائی تم نے تو ہر ویلن کی کمر توڑ دی اور ہر رائٹر کا قلم توڑ دیا ہے۔

" منشی جی!" رگھو بھائی بولا

" جی مالک!"

" تم بہت اچھا آدمی ہے۔ ایکدم فرسٹ کلاس منشی ہے ہم تم کو سو روپیہ انعام دیتا ہے"

رگھو بھائی نے خوش ہو کر کہا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مجھے عطا کیا۔ تم کیا نیا آئیڈیا ہم کو دیتا ہے اسی لئے ہم تم کو

رکھے ہوئے ہیے !۔"

"آپ کی عنایت ہے۔ میں نے سر جھکا کے اور نوٹ کو تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں" عنایت اب ہماری نہیں ہے۔ عنایت بائی کو ہم نے اپنی فلم کمپنی سے نکال دیا ہے۔ سالی بہت نفرڑا کرتی تھی۔"

"کیا نفرڑا کرتی تھی؟

"بہت رگڑا کرتی تھی!"

"کیا رگڑا کرتی تھی؟"

"بہت جھگڑا کرتی تھی! وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا

"کیا جھگڑا کرتی تھی؟"

"بولی ہم تمہارے پکچر کے پریمیر پر شفان کا غرارہ پہن کر جائے گا میں بولا۔ تم شفان کا غرارہ پہن کر جائے گا تو اندر سے ننگا نظر آئے گا۔ وہ بولی، ہم اندر سے ایک ایسا بیٹی کوٹ پہنے گا جس میں ہزار ہزار کے نوٹ لگے ہوں گے۔ لوگوں کو اوپر سے شفان نظر آئے گا اندر سے نوٹ! میں نے درزی کو بلا کر پوچھا تو وہ بولا۔ ایسے بیٹی کوٹ پر پانچ لاکھ کے نوٹ لگے گا۔ میں نے کہا سالی ہم تم کو یہ بیٹی کوٹ کیوں دے گا۔ ہم پانچ لاکھ کا بلڈنگ نہیں باندھے گا؟ ہاں ہم تم کو دس روپے کا نوٹ والا بیٹی کوٹ جرور بنا کے دے سکتا ہے۔ اس پر بھی ہمارا تیس ہزار روپیہ لگ

جملائے گا۔ مگر چلو اپنی مرحومہ کے لئے ہم وہ بھی لگا دے گا۔"

"مرحومہ نہیں محبوبہ!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں مرحومہ ہو کہ محبوبہ ہو ایک ہی بات ہے! رگھو بھائی نے لاپرواہی سے کہا۔" ہم کوئی تمہاری طرح منشی نہیں ہے کہ الفاظوں کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا پھرے۔ اس لئے ہم نے عنایت بائی کو فلم کمپنی سے باہر نکال دیا ہے کیونکہ وہ پانچ لاکھ کا بیٹی کوٹ مانگتی ہے!"

"بالکل درست کیا آپ نے!"

"تو تم ہم کو بڑی کہانی کب لکھ دو گے؟" رگھو بھائی نے پوچھا۔

"یہ کہانی بلیک اینڈ وائٹ میں بنے گی یا کلر میں؟ میں نے پوچھا اسی حساب سے کہانی سوچی جائے گی۔ میں نے رُک رُک کر کہا

"بڑی کہانی کبھی بلیک اینڈ وائٹ میں نہیں بن سکتی! میں اس کو کلر میں بناؤں گا۔ اور چار کلر میں!" رگھو بھائی نے گرج کر کہا۔

"چار کلر؟ میں نے پوچھا یعنی لال، پیلا، نیلا اور سبز؟"

"احمق ہو!" رگھو بھائی غصے سے بولا۔" میں اس کو ٹیکنی کلر گیوا کلر۔ ایسٹ مین کلر اور سودہ کلر میں بناؤں گا۔ ہر تین ہزار فٹ کے بعد کلر بدلتا جاؤں گا۔"

"ایسی کہانی کوئی ایک رائٹر اکیلا کیسے لکھ سکتا ہے؟" میں نے عاجزی سے کہا۔ اس کے لئے رائٹر بھی چار سے کم نہیں ہو سکتے۔"

" تم بولو"، رگھو بھائی بولا۔ میں تم کو انڈسٹری کے چار ٹاپ کے رائٹر لا کے دیتا ہوں۔ تم نام بولو"

" سکھ رام ورما !"

" ڈن ! رگھو بھائی میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

" گرجا نند گاگر !"

" ڈن !"

" مہیندر مہاراج آنند !"

" ڈن !"

" اور چوتھا ... ؟ چوتھا ؟ ... میں سوچنے لگا۔

رگھو بھائی " چوتھا۔ وہ خطرہ ایمان کیسا رہیگا ؟"

" خطرہ ایمان ؟ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ پھر یکایک میری سمجھ میں آگیا اور میں فوراً بول اٹھا۔ اچھا اچھا، آپ کا مطلب اختر الایمان سے ہے ؟۔

" اجی نام میں کیا پڑا ہے منشی جی"، رگھو بھائی بیزار ہو کر بولا تم کو دس دفعہ سمجھایا ہے۔ نام کے چکر میں مت پڑا کرو۔ مگر رائٹر وہ بہت بڑا ہے

تو اس کو لے لو۔ ڈن، ڈن !! .... اب بولو۔ کہانی کب دیتے ہو میں دس تاریخ کو مہورت کرنے والا ہوں"، رگھو بھائی نے اعلان کیا

" آج چھ تاریخ ہے اور دس کو مہارت ہے۔ چار دن میں کہانی

کیسے بنے گی ؟"

"کیسے نہیں بنے گی ؟ رگھو بھائی نے پوچھا۔ "جب میں اپنی پکچر میں چار ہیرو، چار ہیروئن لے رہا ہوں اور چار کلر میں بنا رہا ہوں تو کہانی بھی چار دن میں بننی چاہیئے ۔ کیسے بھی کرو۔ اُلٹا سُلٹا کر کے مجھے چار دن میں کہانی بنا کے دو!"

"میں تم سب رائٹر لوگوں کو کھنڈالہ لے چلتا ہوں!"

"خوب!" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اور چار باورچی! وہ بولا

"واہ، واہ!"

"اور چار ہیروئینوں کو بھی!"

"سبحان اللہ!" میں بولا۔

"اور چاروں ہیرو بھی چلیں گے۔"

"ایں ؟ میرے منہ سے مایوسی کی یہ چیخ نکلی۔

"اور چار چھ چھوکری لوگ کو بھی ادھر ادھر سے پکڑ لیتا ہوں!"

"وہ کس لئے ؟ میں نے پوچھا۔

چھوکری لوگ آجو، باجو، میں رہے تو کہانی کا مصالحہ گرما گرم مچے دار اور چٹ پٹا تیار ہوتا ہے"

مجھے ایسا لگا جیسے میں کہانی نہیں بھیل پوری کی چاٹ بنا رہا ہوں۔ مگر میں نے اپنی قسمت پر صبر کرتے ہوئے کہا۔ تو کیجئے

کھنڈالے کی!۔

رگھو بھائی بہت بڑا پروڈیوسر تھا اور بہت بڑا دل رکھتا تھا اس لئے اس نے ان چار دنوں کا اہتمام بڑے شاندار طریقے سے کیا۔ چار دل ہیروئن کے لئے الگ الگ بنگلہ لیا اور خود اپنے لئے اور اپنی نئی محبوبہ کے لئے الگ بنگلہ لیا اور رائٹر لوگوں کے لئے کھنڈالے کے سب سے بڑے ہوٹل انیکسی کرائے پر لے لی۔ یہ ایک بنگلہ نما عمارت تھی اور پہاڑی کے اوپر ایک جنگل میں تھی ایک طرف کھڈ تھی دوسری طرف اونچے ٹیلے تھے تیسری طرف ہوٹل کا نوکر خانہ تھا۔ اور چوتھی طرف قبرستان تھا۔ غرضیکہ لکھنے پڑھنے کے لئے یہ جگہ آئیڈیل تھی۔ رائٹر لوگ اسی انیکسی میں لاکر ڈال دیئے گئے اور ان کے پینے کے لئے رم کا بندوبست بھی کر دیا گیا۔ جبکہ دوسرے پروڈیوسر صرف ٹھرا پلاتے ہیں۔ مگر رگھو بھائی کوئی معمولی پروڈیوسر نہ تھا۔ اس نے رائٹروں کے لئے رم کا، ایکٹروں کے لئے بلیک اینڈ وائٹ وسکی اپنی محبوبہ کے لئے کوئن این کا اور اپنے لئے بلیک ڈاگ کا انتظام کیا تھا۔ کبھی کبھی محض شراب کی قسم سے اس کے پینے والے کی پوزیشن اور رتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دن سیر و تفریح میں گزرا۔ ملنے ملانے میں ایک دوسرے

کو جانتے پہچانتے ہیں۔ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں
رگھو بھائی رمبھا کو لے کر خرید و فروخت کرنے کے لئے لوناؤلہ چلا گیا۔ ہیرو لوگ ہیروئینوں کو لے کر اطالوی مشن کی پہاڑی پر چلے گئے۔ رہ گئے رائٹر لوگ سو وہ آجو باجو کی چھوکریوں سے دل بہلانے لگے۔ کیونکہ آدمی کی حیثیت صرف دولت ہی سے نہیں بلکہ شراب کی قسم اور عورت کے جسم سے بھی عیاں ہوتی ہے ویسے سب انسان برابر ہیں۔

شام کے وقت بزنس سیشن شروع ہوا۔ جس میں کہانی پر بحث ہونا تھی۔ اس سیشن میں چاروں ہیرو، چاروں ہیروئن موجود تھیں اور رائٹر لوگ کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ فلمی کہانی میں رائٹر لوگوں کا دخل بہت کم ہوتا ہے اور جو رائٹر فلمی کہانی میں زیادہ دخل دیتا ہے اسے کسی نہ کسی بہانے فلم کمپنی سے چلتا کر دیا جاتا ہے۔ رائٹر کا زیادہ سے زیادہ کام یہ ہوتا ہے کہ جب دوسرے لوگ کہانی بنالیں وہ اس پر اپنا نام دیدے!

جب سب کے جام مرتبے کے مطابق شراب سے بھر دئیے گئے تو کہانی پر بحث شروع ہوئی مگر چونکہ کہانی ایک سرے سے غائب تھی اس لئے ادھر ادھر کی کہانیوں پر بحث ہوتی رہی۔۔
ہالی وڈ کی دو درجن کہانیاں بحث میں آئیں کچھ مدراس کی فلموں کا تذکرہ چلا۔ کچھ پرانی کامیاب کہانیوں کو پھر سے بنانے کی تجویز پر

غور کیا گیا۔ کچھ رائٹر لوگ ایسے موقع پر بھی اپنے تلخ تجربے کے باوجود باز نہ رہ سکے انہوں نے کچھ اپنی کہانیاں سُنائیں۔ جو فوراً انتہائی بے زاری سے اُسی وقت رد کر دی گئیں۔ آخر میں رگھو بھائی نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر اعلان کیا۔ آہا ہا ایک کہانی کا آئیڈیا آیا ہے!

"کیا ہے؟ کیا ہے؟" بہت سے لوگ اکدم بول اُٹھے۔

"سُبحان اللہ! سُبحان اللہ!" میں نے کہا۔

"کہانی سُنی نہیں اور ابھی سے سُبحان اللہ کرنے لگے؟" ایک رائٹر نے میری کہنی میں ٹھونکا مار کر کہا۔

میں نے کہا۔ "میں کہانی پر سُبحان اللہ نہیں کہہ رہا ہوں... خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ کہانی کا آئیڈیا تو آگیا۔"

"کہانی کیا ہے" دوسرے رائٹر نے پوچھا

"یقیناً اچھی ہو گی!" تیسرا رائٹر بولا۔

"جلدی سے سُنائیے تاکہ اسے لکھ لیا جائے۔ مہورت میں چار ہی دن رہ گئے ہیں!" چوتھا رائٹر کاغذ پنسل تیار کر کے بولا

رمبھا نے مغرور نگاہوں سے سب پر نظر ڈالی۔ اس کی نگاہ گویا کہہ رہی تھی۔ دیکھ لیا، کہانی سب لوگ سناتے رہے لیکن آئیڈیا تو میرے رگھو بھائی کا ہے۔

رگھو بھائی نے کسی قدر شرما کر کہا "کہانی کا آئیڈیا نہیں آیا ہے ابھی پہلا سین سمجھ میں آیا ہے۔ آہا ہا ...

سبحان اللہ، سبحان اللہ! میرے منہ سے بے اختیار نکلا
"کس بات پر؟" - ایک ہیرو ڈیری تصدیق سے خفا ہو کر بولا -
"پہلے سین کے آنے پر! میں نے ہاتھ اُٹھا کے کہا اور جناب والا جب پہلا سین سمجھ میں آجائے تو سمجھو کہانی تیار ہے - کہانی میں اور ہوتا ہی کیا ہے - پہلا سین سمجھ میں آجائے، باقی کہانی خود بخود تیار ہو جاتی ہے -
ریحانہ میری تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگی - اُسے میری بات بہت پسند آئی تھی - اس نے میری طرف مسکرا کے دیکھا میں نے بھی مسکرا کر دیکھا - وہ بڑی خوبصورت تھی - چہرے کا میک اَپ بڑا خوبصورت تھا - اور زیور اس کے بڑے خوبصورت تھے اور جس عورت کے پاس یہ تینوں چیزیں خوبصورت ہوں، وہ بڑی خوبصورت ہوتی ہے
"بے شک، بے شک! ایک ہیرو سر ہلا کر بولا، فلم کی اوپننگ بڑی اہم ہوتی ہے اور اگر فلم کی اوپننگ دھانسو بن جائے تو سمجھو پوری کہانی بن گئی -"
رگھو بھائی کھانس کر بولے - "فلم یوں شروع ہوتی ہے کہ - ایک بہت بڑا ہال ہے، بہت بڑا ہال - اس کے ساٹھ دروازے ہیں اور تین سو ستون ہیں اور چار سو فانوس ہیں اور اُس کے اندر آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں -
آٹھ سو لڑکیاں؟ رائٹر لوگوں کی آجو باجو کی لڑکیاں خوشی

سے چلائیں کیونکہ اگر ڈانس کرنے کے لئے آٹھ سو لڑکیاں ہوں گی تو ان کو کام ملنا ضروری تھا۔!

آٹھ سو لڑکیاں!۔۔۔ ایک سیٹ پر ناچ رہی ہیں!"
رگھو بھائی خوشی سے چلایا۔ یہ میری فلم کی اوپننگ ہے! سمجھے آٹھ سو لڑکیاں ایک سیٹ پر ناچ رہی ہیں!"

دو سو ٹیکنی کلر میں، دو سو گیوا کلر میں، دو سو سودہ کلر میں اور باقی دو سو السیٹ مین کلر میں ناچ رہی ہیں۔" میں نے تجویز پیش کی!

"منشی جی!" رگھو بھائی خفا ہو کر چلایا۔ تم اکدم گدھے ہو۔۔۔!"

"بجا فرمایا!" میں نے آہستہ سے کہا اور اپنی خفت مٹانے کے لئے پنسل منہ میں لے کر چبانے لگا۔

"فرسٹ کلاس آئیڈیا ہے!" دوسرا رائٹر بولا۔

"مگر میرا گلاس خالی ہے!" تیسرا رائٹر بولا۔

"اوپننگ تو اچھا ہے، مگر اس میں ہیرو کہاں ہے"، پہلا ہیرو بولا

"ہیرو کو میں لے کر آتا ہوں" رگھو بھائی جلدی سے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے بولا۔ اور جلدی سے رمبھا نے اپنی کرسی کی اوٹ سے بلیک ڈاگ کی بوتل سے ایک پیگ گلاس میں سوڈے کے ساتھ ڈال کر رگھو بھائی کو پیش کیا۔ رگھو بھائی ایک گھونٹ بھر کے بولا

اب میں ہیرو کو فلم میں لاتا ہوں! رگھو بھائی نے دونوں ہات پھیلا کر فتح یاب نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کے کہا۔ اب

میں ہیرو کو فلم کے اندر لگاتا ہوں۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا جیسے وہ اپنی ٹوپی کے اندر سے ہیرو کے بجائے کسی خرگوش کو نکال لئے جا رہا ہو۔

دیکھئے! اندر آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں۔ ہال کے باہر ہیرو گھوڑا دوڑاتے ہوئے آنکلے ہے ٹپ ٹپ! ٹپا ٹپ!! ٹپا ٹپ!!!

"چھپا چھپ! چھپا چھپ!! چھپا چھپ!!!" دوسرا رائٹر بولا

"مگر میرا گلاس خالی ہے!" تیسرا رائٹر بولا۔

مگر اس کی کمزور آواز کسی نے سُنی نہیں۔ رگھو بھائی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور چلّا کر کہنے لگا۔ ہیرو آتا ہے گھوڑا دوڑاتے ہوئے۔ ٹپا ٹپ۔ ٹپا ٹپ!! ٹپا ٹپ!!! اس کے ہاتھ میں چابک ہے۔ سڑاک سے وہ چابک گھوڑے کے منہ پر مارتا ہے اور اور فٹاک سے اس کی پیٹھ سے اترتا ہے اور دھاک سے سیدھا اندر دروازے سے ہال میں گھُس آتا ہے۔!

سبحان اللہ! سبحان اللہ!" میں جلدی سے چلّایا کہ کہیں کوئی دوسرا رائٹر پہل نہ کر جائے۔!

رگھو بھائی نے خوش ہو کر میری طرف دیکھا، بولا "ایک بات ہے منشی جی، کہانی تم خوب سمجھتے ہو!"

"آپ کی مہربانی ہے!" میں نے آداب بجا لاتے ہوئے کہا۔ اگر اجازت ہو تو ایک آئیڈیا میں بھی عرض کروں!"

"بولو، بولو!" رگھو بھائی خوش ہو کر بولے۔

"ہیرو کو گھوڑے سے مت اتار یئے۔ وہ سڑک سے چابک بھی مارتے اور نتاک سے گھوڑے کی پیٹھ پر اُچھلے۔ مگر اُترنے کی بجائے گھوڑے کو دوڑا کر سیدھا ہال میں آجائے۔ گھوڑے پر سوار اور اندر آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کرتی ہوئی انہیں دیکھ کر ہیرو بھی گھوڑے کو ناچنے کے لئے اشارہ کرتا ہے اور اشارہ پاتے ہی اس کا گھوڑا بھی ناچنے لگتا ہے۔ ذرا خیال کیجئے رگھو بھائی۔ آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں اور ان کے بیچ میں ایک گھوڑا بھی ڈانس کر رہا ہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر ہیرو، ہاتھ بڑھا کر نیچے سے ایک لڑکی کو اوپر اُٹھا لیتا ہے اور اس کے ساتھ گھوڑے کی کاٹھی پر کھڑا ہو کر ڈانس کرنے لگتا ہے۔ وہ لڑکی رمبھا ہے۔!

"ہُرّے! رمبھا زور سے خوشی سے چلّائی۔

"بالکل یہی میں سوچ رہا تھا۔" رگھو بھائی بولا۔

"کیا بات پیدا کی ہے تم نے منشی جی!" پہلا ہیرو زور سے بولا۔

"تم نے میری انٹری تو طے کر دی۔ کمال کر دیا ہے۔ جی چاہتا ہے تمہارا قلم چوم لوں۔

"مگر دوسرا ہیرو کدھر سے آئے گا؟ دوسرا ہیرو، ذرا اُداس ہو کر بولا۔

"کدھر سے بھی آسکتا ہے:" میں نے کہا "ہال کے ساٹھ دروازے ہیں۔

"میں دروازے سے نہیں آؤں گا! دوسرے ہیرو نے خفا ہو کر کہا۔

"پھر تم کدھر سے آ ڈگے؟" رگھو بھائی نے دوسرے ہیرو سے پوچھا۔!

"میں؟ ... میں اب ایک آئیڈیا دیتا ہوں ہال میں آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کے بیچ میں گھوڑا ڈانس کر رہا ہے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر نمبر ون ہیرو کے ساتھ، نمبر ون ہیروئن رمبھا ڈانس کر رہی ہے۔ اتنے میں زور کا ایک پٹاخہ چھوٹتا ہے اور چٹاخ سے روشندان کا کانچ ٹوٹ جاتا ہے اور میں .... دوسرا ہیرو .... روشندان سے چھلانگ لگا کر ہال میں کود پڑتا ہوں اور چلا کر کہتا ہوں ... یاہو!"

"گریٹ!" دوسرا رائٹر بولا۔

"سپربٹ!" چوتھا رائٹر بولا۔

"مگر میرا گلاس خالی ہے!" تیسرا رائٹر بولا۔ مگر اس کی آواز کسی نے سنی نہیں۔

"کہانی کیا تیر کی طرح سیدھی جا رہی ہے!" رگھو بھائی نے فخر سے کہا۔

"کہانی کو اگر اچھی اوپننگ مل جائے، میں نے کہا۔ "تو سمجھو بیڑا پار ہے!
"مگر تیسرا ہیرو کیسے اندر آئے گا۔" تیسرے ہیرو نے پریشان ہوکر پوچھا
آخر کہانی میں ہم بھی تو ہیں!"
"بے شک ہیں آپ!"، دوسرا رائٹر بولا، میرے خیال میں آپ پیدل چل
کر آئیں تو کیسا رہے گا۔ ؟"
"بالکل بنڈل!"، تیسرا ہیرو خفا ہو کر بولا۔ "پہلا ہیرو گھوڑے پر آئے
دوسرا روشندان سے چھلانگ لگا کے آئے اور میں پیدل چل کے آؤں
آپ گھاس کھا گئے ہیں کیا؟
تیسرا رائٹر جس کا گلاس اب تک خالی تھا۔ خالی گلاس کو میز پر
زور سے مار کر بولا۔" ایک آئیڈیا میں بتاتا ہوں اور جواب نہیں ہے
صاحب تیسرے ہیرو کی اینٹری کا۔ واہ واہ! کیا شاندار اینٹری دی ہے
میں نے۔"
"کیا ہے؟ رگھو بھائی نے بے چین ہو کر پوچھا۔
"اہاہا۔ تیسرا رائٹر سر ہلا کر بولا۔ کبھی کبھی کیا آئیڈیا سوجھتا
ہے مجھے بھی داد، واہ کمال کر دیا ہے میں نے بھی۔ ادھو۔ ہو غضب
کی اینٹری ہے۔ سچ کہتا ہوں، ایسی اینٹری دی ہے میں نے کہ ساری
فلم کو اکھاڑ کے پھینک دو مگر اس اینٹری کو اکھاڑ کے نہیں
پھینک سکتے!"
"کیا ہے جلدی بولو بھائی! رگھو بھائی بے حد بے چین ہو کر بولا

مسینئے۔ تیسرے رائٹر نے چلّا کر کہا۔ "پہلا ہیرو گھوڑے پر آتا ہے۔ دوسرا ہیرو روشندان سے چھلانگ لگاتا ہے۔ مگر یہ ہیرو ان دونوں سے اونچا ہے وہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر آتا ہے۔ ایک ہیلی کاپٹر میں! سمجھے آپ، ہیلی کاپٹر فرّاٹے بھرتا ہوا اڑتا چلا آتا ہے اور ہال کے گرد چکّر لگاتا ہے۔ ایک چکّر، دو چکّر، تین چکّر، چار چکّر، پانچ چکّر۔ چھٹے چکّر میں وہ ہیلی کاپٹر کو اڑاتا ہوا اور دروازے سے سیدھا اندر داخل ہو جاتا ہے اور اندر جاتے ہی ہیلی کاپٹر کو پیانو کے اوپر کھڑا کر دیتا ہے اور ناچتا ہے چکا چکا بوم، چکا چکا بوم "بروبر!" اکدم بروبر! رگھو بھائی خوشی سے چلایا۔ یہ انٹری ایک دم پاس ہے۔ بیرہ رائٹر صاحب کا گلاس شراب سے بھر دو۔

"مگر میں کدھر ہوں؟ چوتھا ہیرو رنجیدہ سُر میں بولا۔ میں کدھر سے آتا ہوں اس سین میں؟"

تمہارے لئے ایک خندق کھودنی پڑے گی! میں نے چوتھے ہیرو سے کہا۔

"ہال کے نیچے سے؟" چوتھے ہیرو نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"پھر؟" چوتھے ہیرو نے پوچھا۔

"پھر ہال کا ایک کونا پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے چوتھا ہیرو نکلتا ہے ہال میں پستول لئے ہوئے۔

چوتھا رائٹر بولا۔ اور وہ ہال میں آتے ہی دھائیں دھائیں گولیاں
چلانی شروع کرتا ہے۔ چیخیں، دھاڑ۔ دھوم دھڑا کا۔ لڑکیاں تتر بتر
ہو جاتی ہیں۔ چوتھا ہیرو آگے بڑھ کر گھوڑے پہ ناچتا ہوا ہیرو کو
زمین پہ گرا دیتا ہے۔"
اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر . . . اور رمبھا کو لے کر ہال سے
باہر نکل جاتا ہے۔ میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔
سب نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور رمبھا مجھے بڑی گہری
نظروں سے دیکھنے لگی۔

آدھی رات، چاند اور سناٹا۔!
میرے ایک ہاتھ میں جام تھا، دوسرے میں رمبھا کی کمر تھی
اور ہم دونوں کے بیچ میں بلیک ڈاگ کی بوتل رکھی تھی۔
"ڈارلنگ، رمبھا میری طرف میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے
ہوئے بولی" تم کتنے بڑے حرامزادے ہو۔ کیسے مجھے پہلے ہی سین
میں لے آئے کہ چاروں ہیروئنیں منہ دیکھتی رہ گئیں۔!
" تم بھی کچھ کم شور نہیں ہو، پیاری!" میں نے اس کی کمر کو کستے ہوئے
کہا۔ کیسے تم پروڈیوسر کو شراب میں اندھا چھوڑ کر اس وقت میرے
پاس آگئیں اور بلیک ڈاگ کی پوری بوتل ساتھ لے آئیں!"
ہم دونوں آدھی رات کے وقت پروڈیوسر کے بنگلے سے ذرا دور

اطالوی مشن کی پہاڑی پر ممبیئ کی رات کی طرح حسین تھی۔ سامنے ایک چھوٹا سا آبشار فلم کی خالی ریل کی طرح چل رہا تھا اور دور کہیں کسی ریل گاڑی کی کوکو، چترگیت کی کسی دھن کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

"تمہاری وجہ سے میں نے بلیک ڈاگ بھی چکھ لی ورنہ آج تک تو کبھی چکھی نہیں تھی"، میں نے رمبھا سے کہا۔

"یہ دنیا کی سب سے اچھی وسکی ہے جناب!"، رمبھا غرور سے بولی

"تم بھی دنیا کی سب سے حسین عورت ہو"، میں نے رمبھا سے کہا،

"مجھے بھول مت جانا"، رمبھا بولی "ابھی تو کہانی کا پہلا سین ہی ہوا ہے۔"

دیکھتی جاؤ۔ آگے کے سینوں میں بھی تمہیں یوں گھماؤں گا کہ چاروں ہیروئنیں ہاتھ ملتی رہ جائیں گی۔!

رمبھا میرے سینے سے لگ گئی اور ایک آہ بھر کر بولی مجھے تمہاری حرام زدگی پر پورا بھروسہ ہے"

میں اس کے ہونٹوں پر جھک گیا۔

٭

رات خالی۔

خالی جیسے شراب کی بوتل

رات تھکی ہوئی

جیسے پیار کی باہنوں میں لپٹے ہوئے دو جسم۔

رات بے سُدھ
جیسے تیسرے پہر کی اوس میں ڈوبے ہوئے جسم شبنم دھیرے دھیرے پھوہار کی طرح برستی ہوئی پھول ٹوٹ ٹوٹ کر ٹہنیوں سے گرتے ہوئے، بے آواز، بے سُدھ، سپنوں میں کھوئے ہوئے یکایک کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔
میں ہڑبڑا کر اٹھا۔
میرے سر پر رگھو بھائی کھڑا تھا۔
رمبھا نے اک نگاہ اٹھا کے رگھو بھائی کی طرف دیکھا ایک لمحے کے لئے خوف سے چونکی۔ پھر سر جھکا کر سسکنے لگی۔
رگھو بھائی نے گھور کر رمبھا کی طرف دیکھا میرے قریب سے اٹھا کر خالی بوتل کو دیکھا، پھر میری طرف دیکھکر غصّے سے چلّایا۔
"تم؟ ... تم؟ .... میرے منشی ہو کر یہ گستاخی؟ رگھو بھائی کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ میں تم کو ایسا کمینہ اور چور نہیں سمجھتا تھا۔؟"
"معاف کرو رگھو بھائی!" میں نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے پاؤں پر رکھ دئے۔ مجھ سے بڑی گستاخی ہو گئی۔ میں نشے میں اپنا مقام بھول گیا اور تمہاری لڑکی کو چُرا لایا ہوں۔"
"لڑکی؟ .... لڑکی کی کون بات کرتا ہے؟ رگھو بھائی نے چلّا کر کہا۔ سالی لڑکیاں تو بمبئی میں گیارہ ہزار مل جاتی ہیں۔ مگر بلیک ڈاگ نہیں ملتی۔ سارے شہر کو چھان کر میں دو بلیک ڈاگ لایا تھا۔ ایک میں

نے آج پی لی، دوسری تم نے آج رات چُرالی۔
ہائے! رگھو بھائی نے بلیک ڈاگ کی خالی بوتل اُٹھائی اور گلوگیر لہجے میں بولا۔اب میں کل بلیک ڈاگ کہاں سے پیئوں گا؟ اور پرسوں کیا پیئوں گا؟

رگھو بھائی نے بلیک ڈاگ کی خالی بوتل اپنے سینے سے لگا لی۔ اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔!



مس نینی تال

شروع میں میرا مزاج رومانی تھا اور طبیعت حساس تھی۔ مجھے پُھدکتی ہوئی چڑیاں پسند تھیں اور نیلا آسمان اور دھنک کے کھلتے ہوئے رنگ۔ اور وہ عورتیں، ہنستے ہوئے جن کے گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں۔ اور ندی جو پتھروں سے ٹھوکر کھا کر چلتی ہے مگر میرے والد نے میری ایک نہ چلنے دی (ان کا نام گوبند رام ہے) انہوں نے کہا بیٹا یہ دُنیا رنگ کے پہیوں پر نہیں چلتی ہے بلکہ حساب کے پہیوں پر چلتی ہے۔ اس لئے تمہیں شاعر نہیں بلکہ انجنیئر بننا ہوگا۔

ہمیشہ سے مجھے حساب سے نفرت رہی ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا یا اللہ یہ دو اور دو چار کیوں ہوتے ہیں؟ پانچ کیوں نہیں ہوتے۔ تین کیوں نہیں ہوتے، ڈھائی کیوں نہیں ہوتے؟ ایک اور ایک ملا کے دو کیوں ہوتے ہیں؟ ایک کیوں نہیں ہو جاتے۔ جیسے کبھی کبھی زندگی میں ہو جاتے ہیں۔ مگر حساب میں نہیں ہوتے۔ کبھی نہیں ہوتے۔ آپ لاکھ کوشش کر کے دیکھ لیجئے! مگر مجھے چونکہ انجنیئر بننا تھا اس لئے میں نے حساب سیکھنے

میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کردیں اور ڈپلوما حاصل کرتے وقت فرسٹ کلاس پوزیشن بھی حاصل کی۔

اس خبر سے سب سے زیادہ خوشی شاردا کو ہوئی۔ جس کے ساتھ بچپن میں میری منگنی ہو چکی تھی اور جسے میں بھی بہت پسند کرتا تھا ہم لوگ ساتھ کھیلتے تھے، ساتھ پڑھتے تھے ساتھ ساتھ سوچتے سوچتے ہم نے تقریباً طے کر لیا تھا کہ وہ گھر کیا ہوگا جس میں ہم رہیں گے۔ بچوں کی تعداد کتنی ہوگی اور وہ ناشتہ میں کیا کھلایا کرے گی؟ ہم نے سب حساب کر لیا تھا۔

مگر جب انجنیئرنگ کالج سے مجھے فرسٹ کلاس پوزیشن کا ڈپلوما ملا تو ایک دن میرے والد کو لالہ بیوہاری لال ملے جن کی فرم میں میرے والد اکاؤنٹنٹ تھے۔ اور ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس پر غور کر کے میرے والد نے فیصلہ کیا کہ اب میری شادی شاردا سے نہیں بلکہ مدھومتی سے ہوگی جو لالہ بیوہاری لال کی اکلوتی لڑکی تھی اور بڑی حسین تھی۔ اور اس وقت نینی تال میں تھی مجھے اب مدھومتی کا دل جیتنے کے لئے نینی تال جانا ہوگا۔ اگر میں نے مدھومتی کا دل جیت لیا یا کم سے کم اگر مدھومتی نے میری مخالفت نہ کی تو لالہ بیوہاری لال مجھے اپنا گھر داماد بنا لیں گے۔

"مگر میرا ان کا حساب ٹھیک نہیں بیٹھے گا"۔ میں نے اعتراض کیا۔ میں اعتراض نہ کرتا مگر اس وقت میرے ذہن میں شاردا کا

سانولا اور شرمیلا چہرہ بار بار آرہا تھا آنکھوں کے تیکھے کونے آنسوؤں سے بھیگ چلے تھے میں کیا کہوں گا اس سے۔ اب تو ہم نے اپنے گھر کے لئے پردوں کے رنگ تک چُن لئے تھے۔

اس لئے میں نے ذرا زور دے کر کہا۔ "دیکھئے پتاجی۔ لالہ بیوہاری لال کروڑ پتی ہیں۔ انہیں ان کی شان اور مرتبے کے مطابق ایک کروڑ پتی ور مل ہی جائے گا اس میں کوئی دقت نہیں ہوگی!"

"وہ ایسا داماد نہیں چاہتے۔ جس کا اپنا خاندان کروڑ پتی ہو تجربے نے بتایا ہے کہ اکثر ایسے امیر خاندانوں کے بیٹے اپنے باپ کے بزنس میں اپنے سسر کا روپیہ پھنسوا دیتے ہیں اس سے بڑی گڑبڑ ہوتی ہے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ روپیہ الگ پھنس جاتا ہے۔ آدمی جذباتی دلدل میں اُلجھ جاتا ہے۔ لالہ بیوہاری لال ایسی کوئی اُلجھن نہیں، چاہتے اس لئے انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ تم آج ہی نینی تال کے لئے روانہ ہوجاؤ اور مدھومتی کا دل جیتنے کی کوشش کرو تمہیں بہت زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑے گی کیونکہ لالہ بیوہاری لال خود ہی کافی کوشش کر لیتے ہیں ادھر وہ آج کل کانسٹرکشن لائن میں جا رہے ہیں اگر گھر داماد انجینئر ہوگا تو ٹھیکوں میں کتنی بچت ہوگی؟

ذرا خود سوچو کہ پھر تم کیا سے کیا ہو جاؤ گے؟ پھر میرے بڑھاپے میں ماں کے چہرے پر لٹکتی ہوئی جھرّیوں کو گنو۔ اس جہیز کا حساب کرو جو تمہیں اپنی تین کنواری بہنوں کی شادی میں دینا پڑے گا

اس رقم کو آنے پائیوں میں گنو جو تمہیں اپنے چار چھوٹے بھائیوں کی تعلیم میں صرف کرنا ہوگی۔ ٹھیک سے حساب کرو!

میں نے جو ٹھیک سے حساب کیا تو تینی تال جانے کا فیصلہ کر لیا میرا فیصلہ سُن کر شاردا بہت روئی تھی سسکتے سسکتے اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ "رام جی، یہ کس طرح کا حساب ہے؟"

میں نے کہا۔ "اسے ہائر میتھمیٹکس کہتے ہیں!"

-

شاردا کی سانولی بھولی بھالی صورت، مدھومتی کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھی۔ مدھومتی کا اُجلا تیز دلکش حُسن ہیرے کی طرح جگمگاتا تھا۔ اور اسی طرح سخت تھا۔ اس کے ہونٹ یاقوت تھے۔ تو آنکھیں نیلم۔ گال لعل تو دانت موتیوں کی لڑیاں۔ جب وہ ہنستی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ منہ کی چھلنی سے پکھراج کے شفاف دانے بکھر کر گر رہے ہیں۔

ایک دن جب وہ اس طرح بلا وجہ زور سے ہنس رہی تھی تو میرا جی چاہا اس کے منہ کے نیچے اپنا رومال کھول کر رکھ دوں اور پکھراج کے سارے دانے سمیٹ لوں۔ مگر پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ ممکن ہے وہ اعتراض کرے اور میرے حساب میں گڑبڑ ہو جائے

میں مدھومتی کو کالج کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہ بڑی ہی کھلنڈری، خودسر، اور شریر لڑکی تھی بے حد بدمزاج اور

حاکمانہ طبیعت پائی تھی۔ اس لئے وہ کبھی کوئی کام نہیں کرتی تھی مگر ہر سال پاس ہو جاتی تھی۔ کیونکہ یہ کالج اس کے پتا نے قائم کیا ہوا تھا وہ بات بات پر پروفیسروں کا مذاق اُڑا دیتی تھی۔

ایک روز کیمسٹری کے پروفیسر نے اس سے پوچھا (وہ بیچارا نیا نیا آیا تھا اور مدھومتی کو جانتا نہیں تھا۔ ورنہ وہ پوچھتا ہی کیوں)

"فولاد کیسے بناتے ہیں ؟"

"مدھومتی بولی ۔"لوہے سے بناتے ہیں۔!"

"ہاں، ہاں ۔ لوہے سے تو بناتے ہیں ۔ مگر کیسے بناتے ہیں؟"

"انجینئر لوگ بناتے ہیں!"

"انجینئر لوگ بناتے ہیں مگر کیسے بناتے ہیں ؟"

"کارخانے میں بناتے ہیں" مدھومتی تنک کر بولی۔

"ارے کارخانے میں بناتے ہیں ۔ مگر کیسے بناتے ہیں ؟ — پروفیسر نے ذرا گرم ہو کر "کیسے؟" پر بہت زور دے کر پوچھا۔

"اب یہ بہت نامناسب بات ہے پروفیسر صاحب!" مدھومتی بولی "کہ آپ کے ہر سوال کا جواب میں ہی دیتی جاؤں۔ کیمسٹری کے پروفیسر آپ ہیں یا میں نہیں ہوں؟

مگر اس وقت تو میں نے اسے دور دور سے دیکھا تھا۔ جیسے لوگ دوربین سے چاند کو دیکھتے ہیں۔ مگر اس وقت میں مدھومتی کے

ساتھ چل رہا تھا۔ ہاتھ میں ہاتھ لئے ہوئے، تاریک دیواروں کے درمیان چھوٹی سی پہاڑی سڑک پر چاندنی اور سائے کی شطرنج بچھی ہوئی تھی۔ وقت الجبرے کے کسی مشکل سوال کی طرح خاموش تھا اور مدھومتی کی کمر میرے ہاتھ کے جھجکتے ہوئے لمس سے ہر لحظہ ایک نیا زاویہ بناتی تھی۔

نینی تال آنے سے پہلے میں نے برسوں پرانی کرم خوردہ کتابوں کو کھولا اور شیلے، کیٹس، ورڈز ورتھ، بائرن اور لانگ فیلو کے شعر جیومیٹری کی شکلوں کی طرح یاد کئے۔ محبت کی مثلث میں کون سے شعر کس وقت فٹ ہوتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ عشق کا سارا شیرازہ بگڑ جاتا ہے میں نے آج رات کی لمبی سیر میں مدھومتی کے بدلتے ہوئے موڈ اور مزاج کو دیکھ کر ہر عنوان سے شعر پڑھے۔ بلکہ جمع کئے۔ آدمی جب اعداد جمع کرتا ہے تو اس کا ایک اثر ہوتا ہے۔ وہ سب مل کر ایک نتیجہ مرتب کرتے ہیں اس لئے جب اتنے سارے شعر جمع کئے جائیں تو ان کا ایک اثر ہوتا ہے اس لئے جب اتنے سارے شعر جمع کئے تو ان کا ایک اثر کیوں نہ ہوگا۔ اس سے کوئی نتیجہ کیسے برآمد ہوگا؟"

جانے یہ میرے شعروں کے جمع کرنے کا عمل تھا کہ لالہ یو ہاری لال کے خطوں کا۔ کہ رومانی فضا کے نازک خطوط کا، کہ ان زاویوں کا جو میرا ہاتھ اس کی کمر سے بنا رہا تھا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ آج

مدھومتی کا غرور اور مزاج شہد میں پگھل گیا تھا۔ وہ بار بار لمبی لمبی سانسیں لیتی اور چلتے چلتے رُک رُک کر میرے کندھے پر سر رکھ دیتی۔ اور چلتے چلتے میں چونک جاتا۔ دیودار کے پھیلے ہوئے تاریک مُبہم سایوں کے درمیان مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کہیں پر کوئی میرا پیچھا کر رہا ہو۔ کہیں پر اُس پھیلی ہوئی تاریکی کے اندر دو بھیگی بھیگی آنکھیں میرا تعاقب کر رہی ہیں اور کسی کا سانولا شرمایا ہوا چہرہ مجھ سے کوئی شکایت کر رہا ہے!

اور چلتے چلتے میں نے دو تین بار اپنے سر کو جھٹک دیا۔ مجھے اُس عدد کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ جسے میں تفریق کر چکا ہوں۔ اس وقت میری نظر ان اعداد پر ہے جو جمع ہو سکتے ہیں۔

اس طویل سیر کے دوران میں کہیں پر مدھومتی کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ پہلی بار اس نے مجھے ان نگاہوں سے دیکھا جن سے ایک خوبصورت عورت اپنی انگلی میں پہنی ہوئی ہیرے کی ایک نئی انگوٹھی کو دیکھتی ہے۔ پہلی بار اس نے میرے چہرے کو نئی نظروں سے دیکھا اور اندازہ کیا کہ میں کتنی خوبیوں کا مالک ہوں۔"

پھر اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ کل بھی اکیلی میرے ساتھ جانتا پیک پر جائے گی۔ کل مجھے بہت صبح اس کے بنگلے پر پہنچ جانا چاہیئے۔ وہ میرے لئے ایک گھوڑا اور اپنے لئے ایک ڈانڈی منگا کر رکھے گی۔ احتیاطاً۔ "ممکن ہے راستے میں تھک جانے پر کہیں ان

کی ضرورت پڑ جائے۔ ورنہ ہم جائیں گے پیدل ہی۔" اُس نے مجھے کہا اور زور سے میرا ہاتھ دبایا۔

اس رات میں نے اپنے باپ کو ایک خط لکھا۔ اس خط پر صرف تین حرف کنندہ تھے۔ (Q - E - Ì)

اگر اس دنیا میں صرف حساب ہی سب کچھ ہے۔ تو میرا یقین تھا کہ میرا باپ میرا خط پا کر بہت خوش ہو گا۔

دوسرے دن وہ بہت پریشان حال اور بُرے موڈ میں مجھے ملی میں۔ آج تمہارے ساتھ چائنا پیک نہیں جا سکتی؟"

"کیوں؟"

"اور تم بھی نہیں جا سکتے" اُس نے مجھے حکم دیا۔

"کیوں؟" میں نے پھر پوچھا۔

معلوم ہوا مدھومتی کا ایلشیشن کتا بُری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ صبح آیا اُسے سیر کرانے کے لئے لے گئی تھی کہ وہ ایک پہاڑی ڈھلان پر سے پھسلا اور اس کی پچھلی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ بہت بُری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ مدھومتی اس سے بار بار پیار کرتی تھی۔ مگر کتا آخر کتا ہے۔ یعنی وفاداری کے علاوہ ایک جسم بھی رکھتا ہے۔ اور جب جسم میں شدید درد ہو تو کتے جیسا سچی محبت کرنے والا جانور

بھا محبت کرنے کے بجائے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

"تم اسے ڈانڈی میں بٹھا کر فوراً ہسپتال لے جاؤ اور ڈاکٹر سے کہو، فوراً اس کا علاج کرے۔"

نینی تال میں مویشیوں کا ہسپتال کہاں ہے؟ مجھے معلوم نہیں" میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

" اسے جانوروں کے ہسپتال لے جانے کے لئے تمہیں کون کہتا ہے۔ اسے نینی تال کے ہسپتال میں لے جاؤ۔ آدمیوں کے ہسپتال میں"

" اگر ڈاکٹر نے اس کا علاج کرنے سے انکار کیا تو؟

"کیسے کرے گا۔" وہ گرج کر بولی، یہ ہسپتال میرے باپ کا قائم کیا ہوا ہے۔ تم جاؤ، میں ابھی ڈاکٹر کو ٹیلی فون کئے دیتی ہوں۔"

جس ڈانڈی میں وہ میرے ساتھ چائنا پیک جانے والی تھی اُسی ڈانڈی میں، میں نے کتے کو سوار کیا۔ خود ایک گھوڑے پر بیٹھا۔

ہسپتال کے باہر پہنچ کر مزدوروں نے ڈانڈی رکھدی اور میں انہیں رُکنے کے لئے کہہ کر ہسپتال کے اندر داخل ہوا

ایک مثلث نما برآمدے کے اندر کوریڈور تھا اس کوریڈور میں جابجا بنچ بچھے ہوئے تھے جن پر پژمردہ اور ملول بیمار اور ان کے ساتھ آنے والے رشتہ دار اور دوست بڑی بے چینی اور بے صبری سے ہسپتال کے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

" ابھی آدھا حصہ باقی ہے۔" ایک اردلی نے مجھے بتایا۔

"کیا بڑے ڈاکٹر صاحب موجود نہیں ہیں؟" میں نے ہسپتال کے در و دیوار پر ایک نیم مالکانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا پوچھتے وقت خود بخود میرے لہجے میں ایک تیزی سی آگئی تھی۔ آخر اس ہسپتال کو مدھومتی کے باپ یعنی میرے ہونے والے سُسر نے قائم کیا تھا۔

اردلی میرے تحکمانہ لہجے سے چونک گیا۔ پھر اس نے اپنا پوز فوراً بدل لیا اور جھک کر کسی قدر انکساری کے لہجے میں بولا "بڑے ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔!"

"تو انہیں جا کر خبر کر دو۔ مدھومتی میم صاحب کا کُتّا آیا ہے!" اردلی جا کر، کافی دیر تک نہیں لوٹا۔ میں کوریڈور میں ٹہل ٹہل کر مریضوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ دو بڈھے ہوسے ہوسے کھانس رہے تھے اور باری باری کھانستے تھے۔ جب ایک کھانستا بند کرتا تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ ان دونوں میں کسی طرح کا سمجھوتہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک بچہ انتہائی دُبلا پتلا، کمزور اور پیلا اپنی ماں کی گود میں برابر روئے جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بچے کو جس دن سے یہ پیدا ہوا ہے آج تک کبھی مناسب غذا نہیں ملی۔ اور بے چاری ماں۔ اپنے بیٹے کی بھوک کا علاج کسی طرح دنیا سے کرنے کے لئے اُسے شفا خانے لے آئی تھی۔ ایک آدمی بورسے بینچ پر بیٹھا ہوا جانوروں کی طرح ڈکراتا تھا۔ اور تین آدمی اُسے سنبھالنے میں لگے تھے ــــ

پوچھنے پر معلوم ہوا۔رات سے وہ دردِ گُردہ میں مبتلا ہے۔آگے جاکر ایک کونے میں کھاٹ پر ایک آدمی کا جسم پڑا تھا اور جگہ جگہ اس کے جسم سے خون جاری تھا اور بہت سا خون جسم سے بہہ کر کھاٹ کے نیچے ایک چھوٹی سی دلدل میں تبدیل ہو چکا تھا۔معلوم ہوا اُس آدمی پر جنگلی باگھ نے حملہ کیا تھا۔کچّے گوشت کے لوتھڑے سے اس کی ٹانگوں سے اُدھڑ رہے تھے۔ اور اس کا چہرہ بالکل نیلا پڑ گیا تھا۔اس کی آنکھیں بند تھیں۔اور تقریباً جانکنی کی سی حالت تھی۔اس کی بیوی اور بڈھا باپ گھبرا گھبرا کر کبھی ایک اردلی اور کبھی دوسرے اردلی کے پاس جاکر ہاتھ جوڑتے تھے اور ان سے ڈاکٹر کو جلدی خبر کر دینے کے لئے منت سماجت کرتے تھے۔

یکایک بڑا ڈاکٹر اپنے کمرے سے نکلا اُس کے پیچھے دو اردلی مؤدب اور شطرنج کی چال چلتے ہوئے آئے۔ایک اردلی نے میری طرف اشارہ کیا تو ڈاکٹر جلدی سے میری طرف لپکا۔

"سمندر کہاں ہے؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"سمندر تو بمبئی میں ہے" میں نے جواب دیا۔ "بہار میں جھیل ہوتی ہے،سمندر نہیں ہوتا!"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سمندر مدھومتی کے کتے کا نام تھا۔

اس مسئلے پر میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا اس لئے مجھے چند لمحوں تک خاصہ شرمندہ رہنا پڑا۔بعد میں ڈاکٹر کو میں نے بتایا کہ سمندر باہر ڈانڈی

میں پڑا ہے۔ وہ اتنا بھاری ہے کہ میں اسے گود میں اٹھا کر لا نہیں سکتا اور ڈانڈی والے بھی انکاری ہیں۔

"کوئی مضائقہ نہیں" ، ڈاکٹر نے تیز لہجے میں ایک اردلی کو حکم دیا اسٹریچر باہر لے کر جاؤ اور مدھوستی میم صاحب کے کتے کو فوراً اندر لے کر آؤ!"

دو اردلی اسٹریچر لے کر فوراً بھاگے!

بڈھے باپ کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے اور خوف اور دہشت سے اس کے اوپر اٹھے ہوئے ہات کانپ رہے تھے اور وہ تقریباً سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے کو بچا لیجئے اسے باگھ نے کاٹ کھایا ہے!"

ابھی دیکھتا ہوں" ، ڈاکٹر نے بڈھے باپ کو بڑی نرمی سے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اور چند قدم آگے چل کر ریڈور کے باہر کی طرف جانے لگا۔ مگر پھر یہ دیکھ کر رک گیا کہ دو اردلی کتے کو اسٹریچر پر رکھے ہوئے بڑی احتیاط سے لا رہے تھے۔ بڑا ڈاکٹر جلدی سے اسٹریچر کے قریب جا پہنچا اور اس سے انگریزی میں باتیں کرنے لگا۔

"ہیلو سمندر، پور ڈاگی ۔۔۔ ڈونٹ دری

میں نے پوچھا۔ "یہ کتا اپنی دیسی زبان نہیں سمجھتا؟"

ڈاکٹر نے بڑی نخوت سے جواب دیا۔

"صرف انگریزی سمجھتا ہے " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر

اُس نے میری طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کسی نیچ نسل کا کُتّا ہوں مگر دو ٹانگوں والا۔

جب کتے کا اسٹریچر اُس زخمی نوجوان کی چارپائی کے قریب سے گزرا جسے باگھ نے کاٹ کھایا تھا تو اُس نوجوان کی بیوی نے ڈاکٹر کے پاؤں چھُو لئے اور رو رو کر بولی ۔" جرا ایک پل اس کو دیکھ لیجیئو ڈاکٹر صاحب بھگوان کے لئے !"

" ابھی آتا ہوں ، ابھی آتا ہوں ۔" ڈاکٹر نے گھبرا کر اپنا پاؤں پیچھے کر لیا اور اسٹریچر کے ساتھ ساتھ اپریشن روم میں داخل ہو گیا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ہم لوگ اپریشن روم سے نکلے۔ سمندر کے سب زخموں پر ٹانکے لگا دئے گئے تھے۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی جوڑ کر اُسے پلاسٹر میں رکھ دیا گیا تھا۔

" اب کوئی خطرہ نہیں ہے ،" ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

پھر اس نے سمندر کی تھوتھنی پر ہاتھ پھیرا اور بڑے پیار سے بولا " BRAVE DOG "

کُتّے نے بڑے کمزور سے انداز میں اپنی دُم ہلائی ۔ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اردلی بڑی احتیاط سے دوبارہ اسٹریچر پر رکھنے لگے۔

جب اسٹریچر دوبارہ کوریڈور سے گزر رہا تھا تو ڈاکٹر ہمیں جلدی سے الوداع کہہ کر اُسی زخمی نوجوان کی کھاٹ کی طرف گیا۔ میں بھی کتے کے

اسٹریچر کے ساتھ نہ جا سکا اور ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے جا کے اس کی نبض دیکھی!

"ڈاکٹر صاحب! میرا بیٹا۔" بڈھا باپ کراہتے کراہتے بولا۔ "کسی طرح میرے بادل کی جان بچا لیجئے۔!"

"مگر یہ تو مر چکا ہے" ڈاکٹر نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

جب تک میں زندہ ہوں، میں اس بڈھے کا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا وہ کبھی میری طرف دیکھتا تھا۔ کبھی ڈاکٹر کی طرف اور ہولے ہولے انکار میں سر ہلائے جاتا تھا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں سے آنسو ابھر رہے تھے اور وہ شدید جدوجہد سے انہیں روک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی دن کی داڑھی تھی اور اتنی جھریاں تھیں جتنی کسی ہل چلائے ہوئے کھیت میں ہوتی ہیں۔ چند لمحوں میں اس چہرے کی جھریوں میں پسینے کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔ اس کا سارا چہرہ طوفان میں ہلتے ہوئے پتوں کی طرح کانپنے لگا۔

پہلے چند لمحوں میں جیسے اس کے ہونٹوں نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی پھر یکایک اس کی آواز ایک لاوے کی طرح پھٹ پڑی اور وہ چیخ کر بولا۔ "مگر ابھی تو یہ زندہ تھا۔ یہ! بادل!"

ڈاکٹر چند لمحوں کے لئے چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

واپسی پر میں سارے راستے چپ رہا۔ میں نے گھوڑا چھوڑ دیا تھا اور ڈانڈی والوں کو بھی رخصت کر دیا تھا۔ کیونکہ ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے ازراہِ ہمدردی مدھومتی کے کُتّے کو اسٹریچر پر ہی لے جانے کی اجازت دیدی تھی اور اپنے دو اردلی ساتھ کر دئیے تھے۔ وہ بڑے عمدہ اور زندہ دل اردلی تھے۔ اور طرح طرح کے گیتوں سے میرا دل بہلاتے رہے مگر میں چپ رہا۔

مدھومتی بے حد خوش ہوئی اس نے اردلیوں کو بیس روپے انعام دیا تو اس نے اپنے گال میرے گال سے لگا کر مجھے انعام دیا۔ پھر دیر تک اپنے کُتّے کی طرف متوجہ رہی اور میں چپ چاپ کھڑا رہا اور اندر ہی اندر میرا دل بیٹھتا رہا۔

وہ مجھے اُداس دیکھ کر بولی "تم تو ایسے بسور رہے ہو جیسے تمہیں میرے سمندر کے بچ جانے کی رتّی بھر خوشی نہ ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے" میں نے نرمی سے کہا۔

"پھر کیا بات ہے؟" وہ اکدم بھڑک کر بولی۔

میں نے اسے ہسپتال کا سارا قصّہ سُنا دیا۔

سُنکر وہ فوراً سر جھٹک کر بولی۔ باولے ہوتے ہو؟ یہ جانگلو تو اکثر باگھ کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ باگھ تو ان کو کھاتے ہی رہتے ہیں اور کھاتے ہی رہیں گے۔ ایسے سینکڑوں کیس ہو چکے ہیں اور ہزاروں لوگ ہسپتالوں

میں مرتے رہتے ہیں۔ اور جانے اس لمحے جب تم ہم دونوں بات کر رہے ہیں کتنے لاکھ لوگ اس دنیا میں ایک منٹ میں مر جاتے ہیں اس طرح حساب کرنے لگو گے تو دنیا میں کوئی کام نہ کر سکو گے سری رام!

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر بنگلے کے برآمدے میں لے آئی اور آنکھیں نچاتے ہوئے بولی۔ "آؤ۔ یہاں بیٹھتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں گرم گرم چائے کے گھونٹ پیتے ہیں اور تم سے کیٹس کے پیارے پیارے شعر سنتے ہیں۔ ہائے کیٹس کے شعر کتنے نرم اور ملائم ہوتے ہیں بالکل میرے کتّے کے بالوں کی طرح!

دیر تک وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی مجھے رجھاتی رہی اور پرچاتی رہی مگر میرا دل کسی طرح نہیں بہلا اور میں انتہائی کوشش کے بعد بھی چپ چپ اور اداس بیٹھا رہا۔ ایک عجیب سی جامد و ساکت اداسی تھی جس نے میرے محسوسات کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نہ بول سکتا تھا نہ ہنس سکتا تھا۔ نہ سوچ سکتا تھا۔

چائے آئی اُس نے اپنے ہاتھ سے میرے لئے چائے بنائی پھر بسکٹوں کی پلیٹ آگے بڑھا کر بولی۔ "لو کھاؤ!"

میں نے خاموشی سے انکار کر دیا تو اس نے ایک بسکٹ اٹھا کر زبردستی میرے منہ میں ڈال دیا۔ بولی "کھانا پڑے گا۔ کھاؤ!"

میں بسکٹ کھانے لگا۔ پھر ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا میں بسکٹ چبا رہا تھا۔ آپ ہی آپ میکانکی انداز میں میرے جبڑے چل رہے تھے

اور میں بسکٹ کھا رہا تھا اور اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جو میں کھا رہا ہوں وہ نہ پھیکا ہے نہ میٹھا ہے۔ نہ نمکین، وہ بسکٹ بھی نہیں ہے بلکہ کچے گوشت کا ایک لجلجا سا ٹکڑا ہے...!

یکایک مجھے زور کی اُبکائی آئی اور میں وہاں سے اُٹھ کر بھاگ گیا مدھوستی مجھے پکارتی ہی رہ گئی۔!

نہیں نہیں، آپ غلط سمجھتے ہیں۔ میں نے شاردا سے شادی نہیں کی۔ شادی تو میں مدھومتی ہی سے کی ہے یہ تو اُن دنوں کی بات ہے جب میں نوجوان اور ناتجربہ کار تھا اور زندگی کے حساب میں پختہ نہیں تھا اب تو میں ایک کامیاب آدمی ہوں ایک بہت بڑی کانسٹرکشن کمپنی کا مالک ہوں۔ اب کہیں پر کتنے ہی لوگ مر جائیں میرے بسکٹ کا ذائقہ نہیں بدلتا۔



ہیروئن

آج نئی ہیروئن کی شوٹنگ کا پہلا دن تھا۔

میک اَپ روم میں نئی ہیروئن سرخ مخمل کے گدّے والے خوبصورت اسٹول پر بیٹھی تھی اور ہیڈ میک اَپ مین اس کے چہرے کا میک اَپ کر رہا تھا۔ ایک اسسٹنٹ اس کے دائیں بازو کا میک اَپ کر رہا تھا۔ دوسرا اسسٹنٹ اس کے بائیں بازو کا۔ تیسرا اسسٹنٹ نئی ہیروئن کے پاؤں کی آرائش میں مصروف تھا۔ ایک ہیئر ڈریسر عورت نئی ہیروئن کے بالوں کو ہولے ہولے کھولنے میں مصروف تھی۔ سامنے سنگار میز پر پیرس، لندن اور ہالی وڈ کا سامانِ آرائش وجمال بکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

ایک وقت وہ تھا جب نئی ہیروئن کو ایک معمولی جاپانی لپ اسٹک کے لئے ہفتوں اپنے شوہر سے لڑنا پڑتا تھا۔ اس وقت اس کا شوہر مدن اسی میک اَپ روم کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا خاموشی سے یہی سوچ سوچ کر مسکرا رہا تھا کیسی مشکل زندگی تھی ان دونوں کی۔

آج سے تین سال پہلے مدن کلرک تھا۔ تھرڈ ڈویژن کلرک اور

ایک سو ساٹھ روپے تنخواہ پاتا تھا۔ ناداری اور غربت کی زندگی تھی۔ کبھی کوٹ کا کالر پھٹا ہے، تو کبھی قمیض کی آستین۔ تو کبھی بلاؤز کی پشت۔ آگے پیچھے جدھر سے بھی وہ دیکھتا تھا اُسے وہ زندگی پھٹی کٹی بوسیدہ اور تار تار نظر آتی ہے۔ ایسی زندگی جس میں کوئی آسمان نہیں ہوتا۔ کوئی پھول نہیں ہوتا۔ کوئی مسکراہٹ نہیں ہوتی۔ ایک نیم فاقہ زدہ جھلائی کھسیائی ہوئی زندگی جو ایک پرانی بدبودار ترپال کی طرح دنوں مہینوں اور سالوں کے کھونٹوں سے بندھی ہوئی ہر وقت احساس پر چھائی رہتی ہے۔ مدن اس زندگی کے ہر کھونٹے کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ اور کسی موقع کی تلاش میں تھا۔

یہ موقعہ اُسے ملک گردھاری لال نے دے دیا۔ ملک گردھاری لال اُس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ انہیں دنوں میں دفتر میں ایک اسسٹنٹ کی نئی آسامی منظور ہوئی تھی جس کے لئے مدن نے بھی درخواست دی تھی۔ اور مدن سینئیر تھا اور لائق بھی تھا۔ اور جب ملک گردھاری لال نے جب اس کی عرضی پڑھی تو اُسے اپنے پاس بُلایا اور کہا۔

"مدن تمہاری عرضی میں کئی نقص ہیں!"

"تو آپ ہی کوئی گُر بتلیئے!"

ملک گردھاری لال نے قدرے توقف کے بعد مدن کی عرضی اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "آج رات کو میں تمہارے گھر آؤں گا اور تمہیں بتاؤں گا۔!

مدن بے حد خوش ہوا۔ گھر جا کر اس نے اپنی بیوی پریم لتا سے

خاص طور پر اچھا کھانا تیار کرنے کی فرمائش کی۔ پریم لتا نے بڑی محنت سے روغن جوش۔ پنیر مٹر۔ آلو، گوبھی اور گُچھیوں والا پلاؤ تیار کیا۔

سرِشام ہی ملک گردھاری لال مدن کے گھر آ گیا اور ساتھ ہی وِسکی کی ایک بوتل بھی لیتا آیا۔ پریم لتا نے جلدی سے پاپڑ تلے۔ بیسن اور پیاز کے پکوڑے تیار کئے اور پلیٹوں میں سجا کر بیچ بیچ میں خود آ کر انہیں پیش کرتی رہی۔

چوتھے پیگ پر وہ پالک کے ساگ والی پھلکیاں پلیٹ میں سجا کے لائی تو ملک گردھاری لال نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "پریم لتا، تو بھی بیٹھ جا اور آج ہمارے ساتھ وِسکی کی چسکی لگا لے تیرا پتی میرا اسسٹنٹ ہونے جا رہا ہے۔۔۔!"

پریم لتا سر سے پاؤں تک کانپنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ کیونکہ آج تک اس کے خاوند کے سوا کسی نے اُسے اس طرح ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پھلکیوں کی پلیٹ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی اور مدن نے گرج کر کہا۔

"ملک گردھاری لال۔ میری بیوی کو ہاتھ لگانے کی ہمت تجھے کیسے ہوئی" مدن کا چانس مارا گیا۔ اُس کے بجائے سردار اوتار سنگھ اسسٹنٹ بن گیا۔ پھر چند دنوں کے بعد کسی معمولی غلطی کی بنا پر وہ اپنی نوکری سے الگ کر دیا گیا۔ اور مدن نے کئی ماہ دہلی کے دفتروں میں ٹکریں مارتے

کے لبعد بمبئی آنے کی ٹھانی۔ کیونکہ اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی۔ مدن کے دوستوں کا خیال تھا کہ پریم لتا اتنی ہی حسین ہے جتنی نیم پکار میں تھی۔ وحیدہ رحمان پیاسا میں تھی۔ مدھوبالا مغلِ اعظم میں تھی۔ اس لئے مدن کو چاہیئے کہ پریم لتا کو بمبئی میں لے جائے۔ دہلی میں خوبصورت بیوی والے مرد کی ترقی کے لئے بڑی گنجائش ہے؛ مدن اگر اسسٹنٹ بن بھی جاتا تو زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو روپئے پانے لگتا۔ ایک سو ساٹھ کی بجائے ڈھائی سو روپے، یعنی نوّے روپے کے لئے اپنی عزت گنوا دینا۔ یہ تو سراسر حماقت ہے۔ اس لئے مدن کو سیدھے بمبئی جانا چاہیئے۔

مگر جب مدن نے پریم لتا سے اس کا ذکر کیا تو وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ وہ ایک گھریلو لڑکی تھی۔ اُسے کھانا پکانا، سینا، پرونا، کپڑے دھونا، جھاڑو دینا اور اپنے شوہر کے لئے سوئیٹر بُننا بہت پسند تھا وہ چودہ روپے کی ساڑھی اور دو روپے کے بلاوز میں بے حد خوش اور مگن تھی۔ نہیں وہ کبھی بمبئی نہیں جائے گی وہ کسی اسکول میں کام کریگی مگر بمبئی نہیں جائے گی۔

پہلے دو تین دن تو مدن اسے سمجھاتا رہا جب وہ کسی طرح نہ مانی تو وہ اُسے پیٹنے لگا۔ دو دن چار چوٹ کی مار کھا کر پریم لتا سیدھی ہو گئی اور بمبئی جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

جب پریم لتا اور مدن بوری بندر کے اسٹیشن پر اُترے تو ان کے

پاس صرف ایک بستر تھا۔ دو سوٹ کیس تھے ۔چند سو روپے تھے اور پریم لتا کے جہیز کا زیور تھا۔ چند دن وہ لوگ کالبا دیوی کے ایک دھرم شالہ میں رہے اور مکان ڈھونڈتے رہے ۔جب انہیں معلوم ہوا کہ جتنے کا زیور پریم لتا کے پاس ہے اور جتنے روپے مدن کے پاس ہیں وہ سارے ملا کر بھی اتنے نہیں ہو سکتے کہ بمبئی میں پگڑی دے کر ایک مکان لیا جائے ۔ تو وہ لوگ دھرم شالے سے گورے گاؤں کی جھونپڑی میں منتقل ہو گئے۔ جہاں سب سے پہلے مدن کی لڑائی جھونپڑی میں رہنے والے ایک غنڈے سے ہوئی ۔جو شراب پی کر پریم لتا کی عزت پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لڑائی کے زخم کا نشان آج بھی مدن کی کلائی پر موجود تھا۔ مگر ان سے لڑا بڑی بہادری اور جی داری سے لڑ کر جھونپڑیوں میں رہنے والے بنیادی طور پر غریب آدمی تھے وہ ایک دوسرے کا حق سمجھتے تھے ۔

جھونپڑی میں رہ کر مدن نے پریم لتا کو ساتھ لے کر ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو کے چکر لگانے شروع کئے ، دن گذر گئے ۔ مہینے گذر گئے ۔چکر لگاتے لگاتے فاقے شروع ہوئے پہلے نقدی ختم ہوئی ۔پھر پریم لتا کے زیور بکے ۔پھر قیمتی ساڑھیاں پھر کم قیمتی ساڑھیاں ۔ آخر میں مدن کے پاس صرف ایک قمیض اور پتلون رہ گئی جو اس کے بدن پر تھی اور پریم لتا کے پاس صرف ایک ساڑھی اور ایک بلاؤز اور وہ بھی پشت پر سے پھٹ گیا تھا۔

آپ کا ڈریس آیا ہے۔" ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر آگیا آواز بلند بولا اور مدن خوابِ خرگوش سے جاگا اور اس نے دیکھا کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے ہمراہ ایک درزی ہیروئن کا نیا ڈریس لے کر چلا آرہا ہے۔ جامنی رنگ کا اطلسی غرارہ، زرد زری کے کام کا بنارسی کرتا اور بلو شفان کا ڈوپٹہ سنہرے گوٹے کے لہریوں سے جھلمل جھلمل کرتا ہوا! ڈریس کے اندر آتے ہی محسوس ہوا گویا میک اَپ روم میں ایک فانوس روشن ہو گیا۔

ہیروئن میک اَپ ختم کر کے ڈریسنگ روم میں لباس بدلنے کے لئے چلی گئی۔ لیڈی ہیئر ڈریسر اور دو خادمائیں اس کے پہلو میں تھیں اسے یوں جاتے دیکھ کر مدن کے ہونٹوں پر فتح یابی کی ایک کامران مسکراہٹ نمودار ہوئی اس دن کے لئے اس نے جدوجہد کی تھی۔ اس دن کے لئے وہ جیا تھا۔ اس دن کے لئے اس نے فاقہ کیا اور چنے کھا کر — اور نیلی پتلون اور میلی قمیض پہن کر تپتی دوپہریوں یا موسلا دھار برسات سے بھیگی ہوئی شاموں میں وہ پروڈیوسروں کے دفتروں اور گھروں کے چکر لگاتا رہا تھا۔ آج اس کی کامیابی کا پہلا دن تھا۔ کامیابی کی پہلی سیڑھی اسے چمن بھائی نے سجھائی تھی۔ چمن بھائی فلم پروڈیوسروں کو کرائے پر ڈریس سپلائی کرتا تھا اور اکثر اوقات مختلف پروڈیوسروں کے دفتروں یا مختلف اسٹوڈیو میں اسے مل جاتا تھا ایک دن جب مدن بھٹے حالوں اس

طرح گھوم رہا تھا۔ چمن بھائی نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا۔

"کہیں کام بنا؟"

"نہیں!"

"تم نرے گدھے ہو!"

اب مدن نے گالی سُن کر بھی خاموش رہ جانا سیکھ لیا تھا اسی لئے وہ خاموش رہا۔

دیر تک چمن بھائی بڑے غصّے میں اس کی طرف دیکھ کر گھورتا رہا آخر بولا "آج شام کو میں تمہارے گھر آؤں گا اور تمہیں گُر کی باتیں بتاؤں گا۔"

پریم لتا نے اپنی ساڑھی کے پھٹے ہوئے آنچل سے اپنی جوانی کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اُسی نے بیزار ہو کر منہ پھیر لیا جہاں جاؤ کوئی نہ کوئی ملک گردھاری لال مل جاتا ہے۔

مگر اس شام چمن بھائی نے ان کے جھونپڑے میں بیٹھ کر کاجو پیتے ہوئے کوئی غلط بات نہیں کی۔ البتہ پانچویں پیگ کے بعد چلّا کر بولا۔ جب تک پریم لتا تمہاری بیوی رہے گی یہ کبھی ہیروئن نہیں بن سکتی۔"

"کیا بکتے ہو۔؟" مدن غصّے سے چلّا کر بولا۔

"ٹھیک بکتا ہوں۔" چمن بھائی بات چلّا کر زوردار لہجے میں

بولا۔ "سالا یہاں کس کو تمہاری بیوی دیکھنے کی چاہت ہے۔ سب لوگ بل مجور سے لے کر بل مالک تک فلم کی ہیروئن کو کنواری دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"کنواری؟"

"اکدم ورجن۔

"مگر میری بیوی کنواری کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ تو شادی شدہ ہے"

"تو اس کو شادی والی مت بولو، کنواری بولو، اپنی بیوی مت بولو۔ بولو یہ لڑکی میری بہن ہے۔"

میری بہن؟ مدن نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں، تمہاری بہن . . . . ارے بابا کون تمہاری اس جھونپڑی میں دیکھنے کو آتا ہے کہ یہ تمہاری بہن ہے۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟"

چمن بھائی تو یہ گر بتلا کر چلا گیا۔ مگر پریم لتا نہیں مانی۔ مدن کے بار بار سمجھانے پر بھی نہیں مانی۔

"میں اپنے شوہر کو اپنا سگا بھائی بناؤں گی؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے میں مرجاؤں گی۔ تم میری زبان گدی سے باہر کھینچو گے جب بھی میں اپنے پتی کو اپنا بھائی نہیں کہوں گی۔

آخر مدن کو پھر اسے پیٹنا پڑا۔ دو دن پریم لتا نے چار چوٹ کھائی تو سیدھی ہو گئی اور فلم پروڈیوسروں کے دفتر میں جا کر اپنے شوہر کو اپنا بھائی بتانے لگی۔

چمن بھائی نے مدن کو اپنے ایک دوست پروڈیوسر چھگن بھائی سے ملوا دیا۔ چھگن بھائی نے پریم لتا کے فوٹو، ایک کمرشل اسٹوڈیو سے نکلوائے اپنے ڈائریکٹر مرزا عزت بیگ کو بلوا کر پریم لتا سے اس کا تعارف کرایا۔ مرزا عزت بیگ نے بڑی گہری نظروں سے پریم لتا کو دیکھا اس سے بات چیت کی پھر اسکرین ٹیسٹ کے لیے ہاں کر دی اسکرین ٹیسٹ کے لیے فلم کا ایک سین پریم لتا کو یاد کرنے کے لئے دیا گیا اور تین دن کے بعد اسکرین ٹیسٹ رکھا گیا تینوں دن ہر روز شام کے وقت چمن بھائی جھونپڑے میں مدن اور پریم لتا سے ملنے کے لئے آتا رہا اور کاجو پیتا رہا اور ان دونوں کا حوصلہ بڑھاتا رہا

تیسرے دن چمن بھائی نے مدن سے کہا۔ "آج اسکرین ٹیسٹ ہے، میری مانو تو تم آج پریم لتا کے ساتھ نہ جاؤ۔"

"کیوں نہ جاؤں؟"

اس لئے کہ اگر تم ساتھ گئے تو پریم لتا فری ایکٹنگ نہ کر سکے گی تمہیں دیکھ کر شرما جائے گی اور گھبرا جائے گی۔ اور اگر پریم لتا گھبرا گئی تو اسکرین ٹیسٹ میں فیل ہو جائے گی۔"

"کیسے فیل ہو جائے گی؟" مدن شراب کے نشے میں جھلا کر بولا "میری بیوی نسیم، سچرا اسین، مدھو بالا سے خوبصورت ہے میری بیوی کرسٹین کیلر سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ میری بیوی نرگس سے بہتر اداکارہ ہے میری بیوی کسی اسکرین ٹیسٹ میں فیل نہیں

ہوسکتی، میری بیوی۔"

"ابے سالے بیوی نہیں، بہن بول بہن!" چمن بھائی ہاتھ ہلاتے ہوئے زور سے بولا۔

"اچھا بہن ہی سہی" مدن شراب کا جام خالی کرتے ہوئے بولا۔

"جیسا تم بولوگے چمن بھائی، ایسا ہی میں کروں گا۔ آج تک تمہاری کوئی بات ٹالی ہے جو اب ٹالوں گا۔ لے جاؤ۔ میرے بھائی، اپنی بہن کو تم ہی آج اسکرین ٹیسٹ کے لئے لے جاؤ۔ مگر حفاظت سے پہنچا دینا"

"کھاتری رکھو۔ اپنی گاڑی میں لے کر جا رہا ہوں۔ اپنی گاڑی میں لے کر آؤں گا۔"

بہت رات گئے پریم لتا اسکرین ٹیسٹ سے پروڈیوسر کی گاڑی میں لوٹی۔ اس نے وہی ساڑی پہن رکھی تھی جو اسکرین ٹیسٹ کے لئے استعمال کی گئی تھی اور اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔۔۔

مدن غصّے سے پاگل ہوگیا۔ "تم نے شراب پی؟"

"ہاں سین میں ایسا ہی کرنا تھا۔"

"مگر پہلے سین میں جو تمہیں دیا گیا تھا اس میں ایسا نہیں تھا۔"

"مرزا بیگ نے سین بدل دیا تھا۔"

"تو تم نے شراب پی، صرف شراب پی؟" مدن نے اسے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں صرف شراب پی۔"

"اور تو کچھ نہیں ہوا؟"

"نہیں" پریم لتا بولی "البتہ سین کی ریہرسل الگ سے کراتے ہوئے مرزا عزّت بیگ نے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔"

"کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ کیوں؟ مدن نے اکدم بھڑک کر کہا۔

"سین کا ایکشن سمجھانے کی خاطر!" پریم لتا بولی۔

"مدن کا غصّہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ سے بولا۔ صرف کمر میں ہاتھ ڈالا، عزّت پر ہاتھ تو نہیں ڈالا؟"

"نہیں۔" پریم لتا نے نظریں چرا کر کہا۔

"صاف صاف بتاؤ کچھ اور تو نہیں ہوا؟"

"ہاں ہوا تھا۔" پریم لتا جھجکتے جھجکتے بولی۔

"کیا ہوا تھا؟ مدن پھر بھڑکنے لگا۔

"اسکرین ٹیسٹ کے دوران میں وہ جو میرے سامنے ہیرو کا کام کر رہا تھا۔ اس نے زور سے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔"

"ایسا اس بدمعاش نے کیوں کیا؟ مدن گرج کر بولا۔

"سین ہی ایسا تھا۔" پریم لتا بولی۔

"اچھا سین ہی ایسا تھا۔ مدن اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ جب سین ہی ایسا تھا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ مگر ٹھیک ٹھیک بتاؤ صرف بانہوں میں لے کر بھینچا تھا نا؟"

"ہاں صرف بانہوں میں لے کر بھینچا تھا۔" پریم لتا گلوگیر لہجے میں بولی۔ پھر یکا یک بستر پر گر کر تکیے میں سر چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"شاٹ تیار ہے!"

یہ پروڈیوسر جگن کی آواز تھی۔ مدن اس آواز کو سن کر چونک گیا۔ اور بے اختیار کرسی سے اٹھ گیا۔ چھگن بھائی مدن کو دیکھ کر مسکرایا ہاتھ بڑھا کر اس نے مدن سے مصافحہ کیا۔ بڑے پیار سے اس کے کاندھے پر ہات رکھا اور اس سے پوچھا۔

"سروج بالا کہاں ہے؟"

چھگن بھائی نے اپنی نئی ہیروئن کا نام پریم لتا سے بدل کر سروج بالا رکھ دیا تھا۔ بیشتر اس کے کہ مدن کوئی جواب دے۔ نئی ہیروئن خود ڈریسنگ روم سے نکل کر خراماں خراماں میک اپ روم میں چلی آئی اور نئے لباس، نئے ہیر اسٹائل اور مکمل میک اپ کے ساتھ ہر قدم پر ایک نیا فتنہ بیدار کرتے ہوئے آئی۔ چند لمحوں تک تو مدن بالکل مبہوت کھڑا اُسے دیکھتا رہا گویا اُسے یقین نہ ہوا کہ یہ عورت اس کی بیوی پریم لتا ہے۔ چھگن بھائی بھی ایک لمحے کے لئے بھونچکا رہ گیا اور اس ایک لمحے میں اسے مکمل اطمینان ہو گیا کہ اس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا۔

دوسرے لمحے میں چھگن بھائی نے تھیٹریکل انداز میں اپنے سینے پر اپنا ہاتھ رکھا اور بلند آواز میں کہنے لگا۔ "شاٹ تیار ہے سرکار سیٹ پر تشریف لے چلیئے۔"

نئی ہیروئن کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مدن کو ایسا لگا جیسے کسی شاہی ہال میں لٹکے ہوئے استنبولی فانوس کی بہت سی بلوریں قلمیں ایک ساتھ بج اٹھیں۔ نئی ہیروئن گویا مسکراہٹ کے موتی بکھیرتی ہوئی چھگن بھائی کے ساتھ سیٹ پر چلی۔ مدن بھی پیچھے پیچھے چلا اور چھگن بھائی کو اپنی بیوی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر مدن کو وہ دن یاد آیا۔ جب چھگن بھائی نے اسکرین ٹیسٹ کے چند دن بعد مدن کو اپنے دفتر بلا بھیجا تھا۔

چھگن بھائی مدن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر خود اسے اندر کمرے میں لے گیا تھا۔ جو ایئر کنڈیشنڈ تھا اور چھگن بھائی کا اپنا خاتی اور پرائیویٹ کمرہ تھا۔ جس میں بزنس کے تمام اہم امور طے ہوتے تھے۔ جب مدن اس کمرے کے اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس سے پہلے اس کمرے میں مرزا عزّت بیگ اور چمن بھائی بیٹھے ہوئے ہیں۔

•

•

"آج بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہے۔" چمن بھائی نے ہنس کر کہا۔"

"آج ہم لوگ ایک سونے کی کان خریدنے جا رہے ہیں..."
"سونے کی کان؟ بدن نے تعجب سے پوچھا۔
" ہاں اور تمہارا بھی اس میں حصّہ ہے۔ ایک چوتھائی کا اور باقی تین تمہارے پارٹنر تمہارے سامنے اس کمرے میں بیٹھے ہیں..."
میں جھینگن بھائی۔ یہ میرا دوست چمن بھائی۔ یہ میرا ڈائرکٹر مرزا عزّت بیگ۔ ہم چاروں آج سے اس سونے کی کان کے پارٹنر ہوں گے
"اور یہ سونے کی کان کہاں ہے؟"
جھینگن بھائی نے جواب میں میز سے ایک تصویر اُٹھائی اور بدن کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ رہی؟"
"یہ پریم لتا کی تصویر تھی۔
بدن نے حیرت سے کہا"۔ مگر یہ تو میری... بیو... میرا مطلب ہے میری بہن کی تصویر ہے"
"یہی سونے کی نئی کان ہے۔ تمہاری بہن کو اپنی نئی پکچر میں ہیروئن لے رہا ہوں اور انڈسٹری کے ٹاپ ہیرو کے سنگ... دلیپ راج کے سنگ جس کی کوئی تصویر سلور جوبلی سے ادھر اُترتی ہی نہیں، بولو؟
پھر ایک پکچر کے بعد اس ہیروئن کی قسمت ڈھائی لاکھ ہوگی کہ نہیں
اس کو میں سونے کی کان بولتا ہوں تو کیا غلط بولتا ہوں؟ جواب دو
" مگر میں پوچھتا ہوں کہ میری سونے کی کان آپ کی کیسی ہو گئی
بدن نے حیران ہو کر پوچھا۔

کیوں کہ میں اُسے ہیروئن لے رہا ہوں ،، چھگن بلند آواز میں بولا۔ نہیں تو یہ لڑکی کیا ہے۔ گورے گاؤں کے ایک جھونپڑے میں رہنے والی پندرہ روپے کی چھوکری! پھر میں اس کی پبلسٹی پر چھپّر ہزار روپیہ خرچ کروں کہ نہیں ؟...
.... پھر میں اس کو ہیرو دیوراج کے سنگ ڈال رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر میں اس کان میں ففٹی پرسنٹ کا شیئر مانگتا ہوں تو کیا زیادہ مانگتا ہوں؟ اور صرف پانچ سال کے لئے!"

"اور تم ؟" مدن نے چمن بھائی سے پوچھا۔

"اگر میں تمہیں چھگن بھائی سے نہ ملاتا۔ تو تمہیں یہ کانٹریکٹ آج کہاں سے ملتا۔ اس لئے حساب سے ساڑھے بارہ فیصدی کا کمیشن میرا ہے۔

"اور تم ؟" مدن عزت بیگ کی طرف مڑ کر بولا۔

"اپن تو ڈائریکٹر ہے۔" مرزا عزت بیگ بولا۔ "اپن چاہے تو اس پکچر میں نئی ہیروئن کو فرسٹ کلاس بنا دے، چاہے تو تھرڈ کلاس بنا دے۔ اس لئے اپن کو بھی ساڑھے بارہ فیصدی چاہیئے..."

مگر یہ تو بلیک میل ہے" یکایک مدن بھڑک کر بولا۔

"عزّت کی بات کرو، عزّت کی" عزت بیگ خفا ہو کر بولا۔

"اپن اپنی عزّت ہمیشہ بیگ میں رکھتا ہے۔ اسی لئے اپن کا نام ہی عزّت بیگ ہے۔ اپن عزّت چاہتا ہے۔ اور اپنا شیئر صرف ساڑھے بارہ فیصدی!

یکایک مدن کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے پریم لتا کوئی عورت نہیں ہے وہ ایک کاروباری تجارتی ادارہ ہے جس کے شیئر بمبئی کے اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت کے لئے آ گئے ہیں جیسے گلوب کمبائن الکائن اور ٹاٹا میں ڈیفرڈ۔ ایسے ہی پریم لتا پرائیویٹ لمیٹڈ۔

"مجھے کہاں دستخط کرنے ہوں گے؟" مدن نے تقریباً روہانسا ہو کر پوچھا۔ ناقوں کے ماہ و سال ماضی کا حصہ بن چکے تھے۔ جس دن مدن نے کانٹریکٹ پر دستخط کئے۔ چھگن نے اُسے دو ہزار کا چیک دیا... سلیمان ہل پر ان کے رہنے کے لئے ایک عمدہ فلیٹ ٹھیک کر دیا ایک نئی فیاٹ گلوب موٹرز کی دکان سے نکلوا کے دیدی۔ اسی رات مدن اور پریم لتا اپنے نئے فلیٹ میں چلے گئے اور مدن نے پریم لتا کو گلے سے لگا کر اس کی کامیابی کے لئے دعا کی اور مدن کے پیروں کو چھو کر پریم لتا نے پرتگیا کی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صرف اس کی ہو کر رہے گی

آخر کار مدن کی... محنت اور جدوجہد رنگ لائی آخر کار کامیابی نے مدن کے پاؤں چومے۔ آج اس کی بیوی ہیروئن تھی پریم لتا سروج بالا تھی۔ اور آج اس کی شوٹنگ کا پہلا دن تھا۔

اور اب وہ دن بھی ختم ہو رہا تھا۔ اسٹیج نمبر دن کے باہر مدن اپنی فیاٹ میں بیٹھا ہوا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کب پانچ بجیں گے کب پیک اَپ ہو گا اور کب وہ اپنی دل کی رانی کو اپنی فیاٹ میں بٹھا کر دور کہیں سمندر کے کنارے ڈرائیو کے لئے لے جائے گا۔

پیک اَپ کی گھنٹی بجی۔ مدن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد نئی ہیروئن باہر نکلی۔ اس کا ہاتھ ہیرو کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ دونوں بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے، ہنستے بولتے، ہات جھلاتے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ ساتھ ساتھ فیاٹ سے آگے چلے گئے جہاں ہیرو کی شاندار امپالا گاڑی کھڑی تھی۔

مدن نے فیاٹ کا پٹ کھول کر آواز دی "سروج! " "ہاں بھیّا!" ہیروئن پلٹ کر چلائی۔ اور پھر دوڑتی ہوئی مدن کے پاس آئی اور آہستہ سے بولی۔ "تم گھر جاؤ۔ میں دیوراج کی گاڑی میں آتی ہوں۔"

"مگر تم میری گاڑی میں کیوں نہیں جاسکتیں؟" مدن نے غصّے سے پوچھا۔

"باؤلے ہوئے ہو!" پریم لتا نے علیش کھا کر جواب دیا "میں اب اک ہیروئن ہوں اور اب میں کیسے تمہارے ساتھ اس چھوٹی سی فیاٹ میں بیٹھ کر اسٹوڈیو سے باہر نکل سکتی ہوں۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

"سروج!" ادھر ہیرو زور سے چلایا۔ "آئی!" سروج زور سے چلائی اور پلٹ کر ہیرو کی طرف دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ دیوراج سامنے کی سیٹ پر ڈرائیو کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اور سروج اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ پھر امپالا کے پٹ بند ہوگئے۔ اور وہ خوبصورت فیروزی گاڑی ایک خوش آئند ہارن کی موسیقی پیدا کرتے ہوئے گیٹ سے باہر چلی گئی۔ اور مدن کی فیاٹ کا پٹ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

بینگ بینگ فینڈنگ

دس سال سے ایک کہانی بیچنے کی کوشش کر رہا ہوں کسی طرح بکتی ہی نہیں میں نے دلاور سے کہا۔

دلاور اور میں نشری راؤنڈ اسٹوڈیو کی کینٹین میں بیٹھے دو دن کا بُھنا گوشت ایک ہفتے کی پرانی ڈبل روٹی کے ساتھ کھا رہے تھے۔ چٹنی البتہ تازی تھی اور پیاز کے لچھے بھی اور ہم ہر لقمہ میں اتنی چٹنی اور پیاز بھر لیتے تھے جس سے بدمزہ باسی گوشت کا ذائقہ چھپ جاتا ہے اور چٹنی پیاز کا کرکرا پن اُبھر آتا ہے۔ بالکل کسی بور فلم کی طرح جس میں ایک آدھ سین کبھی کبھی چمک جاتا ہے۔" کہانی کیا ہے؟ دلاور نے سخت جان ڈبل روٹی دانتوں سے توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

دلاور کے دانت اور جبڑے بڑے مضبوط اور گھوڑے سے مشابہ تھے اور اس کی آواز بھی بڑی بھاری اور پاٹ دار تھی۔ دلاور کا خیال تھا کہ وہ ڈبل روٹی اپنے دانتوں سے توڑتا ہے میرا گمان تھا روٹی خود بخود اس کی بھاری بھرکم آواز سن کر سہم جاتی ہے۔ حالانکہ مجھے وہی روٹی نرم کرنے کے لئے پانی استعمال کرنا پڑتا ہے۔

میں گذشتہ دس سال سے فلموں میں تھا اور ابھی تک ایک کہانی نہیں بیچ پایا تھا۔ کہیں کہیں منظر نامہ اور مکالمہ لکھنے کو مل جاتا تھا۔ اُسی پر گزر تھی۔ بخلاف اس کے دلاور کو فلموں میں آئے ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے۔ وہ ان دو سالوں میں چھ کہانیاں بیچ چکا تھا۔ کم داموں میں۔ مگر چھ کہانیاں تو بیچی تھیں اُس نے اور اب وہ جوہو پر ایک چھوٹے سے کاٹج میں رہتا تھا۔ اور میرے پاس چونکہ کوئی جگہ نہ تھی اس لئے میں بھی اس کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ دلاور نے سات سو روپے دے کر ایک پرانی کھٹارا سڈان بھی خرید لی تھی اور اس پر نیا رنگ روغن کر کے اور کچھ کل پرزے بدل کے اسے اس قابل کر لیا تھا کہ ہم دونوں اس میں بیٹھ کے فلم اسٹوڈیو کے چکر لگا سکیں۔ دلاور نے اپنی کاٹج کے باہر ایک چھوٹی سی تختی لگا دی تھی اس پر لکھا ہوا تھا۔ "دوزخ"۔

دلاور بہت دلچسپ آدمی تھا۔ پھرتیلا، شریر، کسرتی اور نیک۔ میں بالکل اس کی ضد تھا۔ خاموش، نرم گفتار، سُست الوجود شاید اسی لئے ہم دونوں میں گھُٹنے لگی تھی۔

"کہانی کا مرکزی خیال بہت عمدہ ہے"۔ میں نے اُسے بتایا۔

"ایک ہیرو ہے"

"وہ تو ہوگا ہی سالا!" دلاور نے ہیرو کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ دلاور ہیرو کے معاملے میں بہت تلخ نوائی کا ثبوت دیتا تھا۔ کیونکہ فلموں

میں وہ ہیرو بننے کے لئے آیا تھا اور اُسے مجبوراً زندہ رہنے کے لئے افسانہ نگار بننا پڑا تھا۔ میں نے کہا " ایک ہیرو کی ماں ہے۔"

" وہ تو ہوگی ہی ماں کے بغیر بھی بیٹا ہو سکتا ہے؟ سالے تو کیا بات کرتا ہے، کیا کہانی سنا رہا ہے؟ ایک ماں تھی۔ ایک بیٹا تھا، سالے شکار پور کا حجام تجھ سے بہتر کہانی لکھ سکتا ہے۔"

دلاور نے ایک زور کا دھپ میری پیٹھ پر دیا۔ میں آزردہ ہو کر چپ ہوگیا " آ گئے؟ دلاور نے پوچھا۔

" کچھ نہیں۔" میں نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ میری آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔

دلاور چند لمحوں کے لئے چپ رہا، مجھے گھورتا رہا، پھر پھٹ پڑا اور بیس پچیس گالیاں سنانے کے بعد بولا۔ " عجیب گاڈری سے پالا پڑا ہے دس سال سے ایک ہی کہانی لئے پھرتا ہے اور ابھی تک اُسے بیچ نہیں پایا اور کہتا ہے کہ اس کا مرکزی خیال بہت اچھا ہے"

" ہاں جو سنتا ہے وہ یہی کہتا ہے۔ کہانی بہت اچھی ہے مگر خریدتا کوئی نہیں۔"

" دلاور نے پوچھا" ۔ کیوں؟ "

" کہتے ہیں دھماکا نہیں ہے!"

"وہ ہم ڈال دیں گے۔ تم کہانی تو سناؤ۔" دلاور نے یکایک نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے مجھ سے کہا "مجھے پسند آئی تو میں تم سے خریدوں گا مگر پوری کہانی سنانے سے پہلے مجھے اس کا مرکزی خیال بتاؤ۔
میں نے کہا۔" ایک ہیرو ہے، ایک ماں ہے۔ ایک اس کی محبوبہ ہے۔"
"محبوبہ کس کی ہے، ماں کی؟" دلاور نے پوچھا۔
"نہیں، ہیرو کی، مذاق کرتے ہو؟" میں نے بھڑک کر کہا۔
"یوں بول ایک ہیرو ہے ایک ماں، ایک ہیرو کی محبوبہ ہے گڑبڑاتا کیوں ہے؟"
میں نے کہا۔" ماں بہت غریب ہے اور بیوہ ہے اور اس نے بڑی محنت اور مشقت سے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر بیٹے کو پڑھایا۔ لکھایا اور جوان کیا ہے اور جب بیٹا جوان ہو جاتا ہے تو اُسے ایک لڑکی سے محبت ہوتی ہے اور لڑکی کو بھی اس سے ہو جاتی ہے!"
"حیرت ہے صاحب لڑکی کو بھی اس سے محبت ہو جاتی ہے" دلاور بولا۔ "ایسا عجیب قصہ تو ہم نے آج تک نہیں سنا۔"
مجھے غصہ تو بہت آیا مگر میں پی گیا کیونکہ میں بھی اب کہانی سنانے پر تُل گیا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے کھولتے ہوئے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

" خیر بیچ کے بہت سے واقعات کٹ کرتا ہوں قصہ مختصر یہ کہ بیٹے محبت دیکھ کر ماں بھی مان جاتی ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے "

" ماں کی بیٹے سے شادی طے کر رہے ہو؟" دلاور نے پوچھا۔

" ماں کی بیٹے سے نہیں ۔ ماں کی ہیروئن سے ۔ میرا مطلب ہے کہ بیٹے کی ہیروئن سے شادی طے ہو جاتی ہے " میں نے غصے سے جھڑک کر کہا اور پھر اپنا غصہ روک کر جلدی جلدی کہانی سنانے لگا۔

" شادی سے ایک ماہ پہلے یکایک ہیروئن بیمار پڑ جاتی ہے۔ اسے بیوکومیا ہو گیا ہے "

" وہ کیا ہوتا ہے ؟ لقوے قسم کی کوئی چیز ؟ "

" نہیں خون کا سرطان ، ایک طرح خون کا کینسر اور اس کا صرف ایک علاج ہے ۔ مریضہ کا خون بدل دیا جائے ۔ مگر مریضہ کے جسم کا خون ایک خاص قسم کا ہے جو بہت مشکل سے ملتا ہے ۔ تلاش بسیار کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ خون تو مل جائے گا۔ مگر اس کی قیمت کئی ہزار روپے ہوگی - یہ قیمت نہ ہیرو ادا کر سکتا ہے نہ ہیروئن "

" اب ہیروئن کا مرنا یقینی ہے اسے اس موت سے صرف ہیرو کی ماں بچا سکتی ہے کیونکہ ہیرو کی ماں کے خون کی قسم بھی وہی ہے جو ہیروئن کے خون کی ہے ۔ اب ہیرو عجب مشکل میں ہے ۔ ماں سے

خون دینے کے لئے کہتا ہے تو ماں کی جان جاتی ہے، نہیں کہتا ہے تو ہیروئن کی جان جاتی ہے۔۔

"بس بس، آگے مت بتاؤ، میں سب سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھے؟" میں نے اس کی طرف حیران ہو کر کہا۔

دلاور نے کینٹین کی میز سے اٹھتے ہوئے کہا "میرے ساتھ موٹو بھائی کے دفتر میں چلے آؤ۔ ابھی اسی وقت کہانی بیچ کر دکھاتا ہوں"

موٹو بھائی پروڈکشنز کے چپراسی نے ہمارا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "سیٹھ اندر کام کر رہا ہے، بولتا ہے کسی کو مت آنے دو۔"

دلاور نے چپراسی کو ہاتھ کے جھٹکے سے پرے پھینک دیا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ موٹو بھائی نے مجھے اور دلاور کو یوں بلا اجازت اندر گھستے دیکھ کر شدید حیرت کا اظہار کیا کیونکہ وہ اس وقت دو دوسرے پروڈیوسروں سے بزنس کی گفتگو میں مصروف تھا۔ دلاور نے اندر آتے ہی دروازہ زور سے بند کیا اور چٹخنی چڑھا دی اور بلند بانگ لہجے میں بولا "اب کوئی شخص آدھے گھنٹے کے لئے باہر نہیں جا سکتا۔"

"مگر میں اس وقت بہت مصروف ہوں، تم تو دیکھتا ہے دلاور بھائی یہ ہیرا بنگال کا ڈسٹری بیوٹر بیٹھا ہے، سیٹھ اودے چند۔ یہ ہیرا حیدرآباد کا ڈسٹری بیوٹر ہے سیٹھ نجلہ بھائی۔"

"فضل بھائی!" حیدر آباد کے ڈسٹری بیوٹر نے اپنا صحیح نام بتایا۔

"ہاں سیٹھ بھاجی بھائی" موٹو بھائی نے تصیح منظور کرتے ہوئے کہا "اس ٹائم کو میرے پاس ٹائم نہیں۔"

دلاور گرج کر بولا۔ "سیٹھ صرف آدھا گھنٹہ مانگتا ہوں۔ ایک کہانی کا آئیڈیا سنانے آیا ہوں۔ کہانی سُن کر پھڑک نہ جاؤ تو میری جوتی میرا سر" یہ کہہ کر دلاور نے اپنے پاؤں سے جوتی نکال کر سامنے کانچ کی تپائی پر رکھ دی۔

سب لوگ حیرت سے جوتی دیکھنے لگے پھر سب لوگ اس سے بھی زیادہ حیرت سے دلاور کا سر دیکھنے لگے مگر دلاور نے اُنہیں آگے سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ بولا "سیٹھ کہانی شروع کرتا ہوں۔ پردہ اسکرین پر ایک جوتا آتا ہے ڈبل سول کا۔ یہ جوتا ہیرو کا ہے۔ ہیرو اپنے جوتے سے زور کی ٹھوکر مارتا ہے۔ ولین کے سر پر۔ ولین لڑھکتا ہوا پیچھے جاتا ہے۔ کیمرہ بھاگتا ہوا آگے جاتا ہے زینے کے پیچھے سے دو غنڈے ولین کے سر پر نمودار ہوتے ہیں۔ ہاتھ میں شمشیر بے نیام کمر میں آفتاب سم صمام آنکھوں پر سیاہ نقاب، گردن میں غوطہ گرداب۔ وہ حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں کہ فوراً پلٹ کر ہیرو اُن کے سامنے آجاتا ہے اس کے ہاتھ میں ریوالور ریوالور ہے۔ ریوالور، ریوالور کا دہانا آگے آتا ہے آگے آتا ہے آگے آتا ہے اور یکا یک پردہ اسکرین پر تین گولیاں چلتی ہیں۔"

بنیگ بنیگ فنٹنگ اور ٹائٹیل شروع ہوتے ہیں۔"
"یہ بنیگ بنیگ فنٹنگ کیا ہے؟" سیٹھ اونرچند نے پوچھا۔
"فلم کا ٹائٹیل ہے۔" دلاور نے بتایا۔

دونوں ڈسٹری بیوٹروں نے مسرت اور حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ آج تک کسی کمپنی نے ایسا ٹائٹیل نہیں دیا تھا۔ دونوں ڈسٹری بیوٹر اپنی کرسیاں کھسکا کر دلاور کے قریب چلے آئے دلاور بھانپ کر بولا "موٹو بھائی! کہانی آگے سناؤں کہ نہیں؟"

موٹو بھائی بھی ڈسٹری بیوٹروں کی دلچسپی بھانپ چکا تھا فوراً لہجہ بدل کر شیریں انداز میں بولا "نہیں نہیں دلاور بھائی اوپننگ تو ایک دھانسو ہے۔ اب کہانی تو سنانی پڑے گی۔ کیوں فجلو بھائی۔ موٹو بھائی نے حیدرآباد کے ڈسٹری بیوٹر سے تائید چاہی۔

"فضل بھائی" حیدرآباد کے ڈسٹری بیوٹر نے کسی قدر بیزار ہو کر اپنا صحیح نام بتایا اور کسی قدر گھبرا کر اپنے قریب کرسی پر بیٹھی ہوئی مس آرادھنا کی طرف دیکھا۔

یوں تو مس آرادھنا موٹو بھائی کی فلم "سندباد کی بیٹی" کی ہیروئن تھیں مگر سارا کام ہیرو کرتی تھیں یعنی گھوڑے دوڑانا۔ بندوق چلانا، دیوار سے کود پڑنا پہاڑ سے چھلانگ لگا کر سمندر میں تیرنے لگنا وغیرہ وغیرہ

اسے شادی کرنے کا بہت شوق تھا۔ اب تک تین دفعہ طلاق ہو چکی تھی اور جو تھے کی نکریں بھی سیٹھ فضل بھائی بڑی میٹھی میٹھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس لیے موٹو بھائی اس کا نام غلط پکارتا تھا تو اُسے بہت غصّہ آتا تھا اور وہ کسی قدر گھبرا کر مس آرادھنا کی طرف دیکھنے لگتا مگر آرادھنا کو بگڑے ہوئے نام میں کسی طرح کی قباحت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ فلموں میں آنے سے پہلے خود اس کا نام گیلا بائی کارتوس والا تھا۔ دلاور نے ایک نظر مس آرادھنا کی طرف دیکھا سلگتی ہوئی آنکھیں سلگتے ہوئے ہونٹ بھرے بھرے پستول کی طرح خطرناک اس کی جوانی تھی

"اب میں فلم کا آخری سین سُناتا ہوں۔"

دلاور یکایک اپنی کرسی پر اُکڑوں ہو کے بیٹھ گیا اور پیشتر اس کے کوئی اعتراض کرے کہ فلم کا پہلا سین سنانے کے بعد آخری سین کیوں سناتے ہو؟ وہ شروع ہو گیا "ذرا دھیان سے سُننا یہ فلم کا اختتام ہے، اینڈ ہے۔ ایسا جگر دھاری خاتمہ دیا ہوں کہ جو سُنے گا اس کے دھرے اُڑ جائیں گے، جو دیکھے گا ہنستا دھار ہو جائے گا۔ جینگ بینگ ننبڈگ سالا کیا رول دیا ہے للتا پوار کو!"

"کیا دیا ہے؟" موٹو بھائی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہیرو کی ماں کا مگر کیا رول دیا ہے سیٹھ؟" دلاور کرسی سے اُچھل کر

موٹو بھائی کے قریب صوفے پر جا بیٹھا اور للتا پوار بھی وہ کام کرے گی، وہ کام کرے گی کہ سب کی دُکان پھاڑ کے رکھ دے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"کان کھول کر سن لو سیٹھ موٹو بھائی! زندگی میں آج تک ایسی کہانی نہیں سُنی ہوگی۔ ایسی فلم نہیں بنی ہوگی۔ للتا پوار ہیرو کی ماں ہے وہ چاہتی ہے ہیرو کی شادی ہیروئن سے ہو جائے مگر ہیروئن انکاری ہے۔ کیونکہ اس کو خون کا لقوہ ہے!"

"خون کا لقوا؟" سیٹھ اودے چند نے پوچھا۔

"لیوکومیا!" میں نے کہا۔

"خون کا لقوہ!" دلاور نے گرج کر کہا۔ "میں نے خود ڈاکٹر سے معلوم کیا ہے۔ بڑی خطرناک بیماری ہوتی ہے اور اس کا علاج صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ مریض کے جسم سے سارا لقوے کا خون نکال دیا جائے اور کسی دوسرے تندرست آدمی کا سارا خون اُسے دے دیا جائے سمجھتے ہو موٹو بھائی؟ سارا خون یعنی خون کے بدلے خون۔ اب جو آدمی اپنا خون دے گا، سارا خون دے گا سالا مر نہیں جائے گا؟ تو مریض مر جائے گا۔ اب ایسی اُلجھن میں کہانی کو لے کر آیا ہوں کہ دیکھنے والا دیکھے تو چکر گھنی کھا جائے ـــــ

عقل غوطۂ گرداب میں اور دل درطۂ استعجاب ہیں۔ کیونکہ ہیروئن کو اگر
کوئی ٹھیک کر سکتا ہے تو وہ ہیرو کی ماں ہے جس کے خون کا نمبر ہیروئن
کے خون سے ملتا ہے، ایک تو ہے ویلین، دوسری ہیرو کی ماں۔ اب
ہیرو بیچارہ کیا کرے؟ دلن کے پاس جا سکتا نہیں اور خود خون دے
نہیں سکتا کیونکہ اس کے خون کا نمبر ہیروئن کے خون سے مختلف ہے
آہا ہا کیا دھڑاکے دار چوئیشن ہے؟ ساری فلم انڈسٹری کی آنکھ میں ڈنڈا
دے رہا ہوں ہے کوئی مائی کا لال ایسی گھنگھور گھٹا چوئیشن بنانے والا؟
مگر شاباش ہے للتا پوار پر۔ وہ سب سنتی ہے کہ اس کے خون دینے سے
مرتی ہوئی ہیروئن کی جان بچ سکتی ہے تو ہونکتی ہانپتی اٹھتی بیٹھتی،
گرتی پڑتی، جھکتی، لڑھکتی اسپتال کے اندر پہنچ جاتی ہے۔ اور پستول
نکال کر ڈاکٹر کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کے جسم کا سارا خون نکال کر
ہیروئن کے جسم میں ڈال دے۔ آہا ہا کیا چوئیشن ہے ادھر ہیروئن
طاقت پکڑتی ہے، اُدھر ماں جاتی ہے، جان دے دی اپنے
بیٹے کے عشق کی خاطر۔ کسی کہانی میں یہ چوئیشن ہے؟ مجھ کو بتاؤ لیلیٰ مجنوں
کہ ہیر رانجھا کہ رومیو جیولیٹ ہیں؟ اور ذرا سوچو کہ للتا پوار اس رول میں
کام کرے گی تو دکان پچھاڑ کے نہیں رکھ دے گی سب کی؟"
میں نے غور سے دیکھا ہو تو بھائی کی آنکھ میں آنسو تھے۔ اور

دونوں ڈسٹری بیوٹر سچویشن کے خوف سے دم بخود تھے۔ دلاور نے زور سے کانچ کی تپائی پر مکا مار کر اُسے ٹکڑے کر دیا۔ بولا " مگر ہیرو کی ماں مرتی نہیں ہے" اس نے گرج کر اعلان کیا۔

"نہیں مرتی ہے؟ موٹو بھائی نے حیرت سے کہا۔

"مر جائے تو کہانی کیا ہوئی جی۔ جناب! ماں مرتی نہیں ہے اس کو ہیروئن بچا لیتی ہے"

"کیسے"

"ایسے" دلاور نے چلا کر کہا اور مس آرادھنا کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھین لیا اور بولا "ہیروئن آپریشن روم کی میز سے اٹھتے ہی پستول ماں کے ہاتھ سے چھین کر باہر بھاگ جاتی ہے اور ہیرو کی موٹر میں سوار ہو کر شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ شہر ختم ہو گیا، سڑک ختم ہو گئی۔ ہیروئن نے جھپاک سے موٹر کا پٹ کھولا، دھڑاک سے چلتے ہوئے ایک گھوڑا سوار کو روکا۔ پٹک سے نیچے گرایا اور دھماک سے خود اوپر چڑھ بیٹھی اور فنا فٹ فنا فٹ فنا فٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے ولین کے قلعے کے اندر جا پہنچی اور نقاب پوش حسینہ بن کر اُس نے ولین کو جا گھیرا اور پھر دہ گھمسان کی لڑائی ہوئی دونوں میں بنگ بنگ فینٹنگ، دھوم دھام، دھڑام فڑام فڑوں فڑوں فنا بچ، گھوڑ ناگ، غضب ناک گھمسان

غٹر دیج لڑائی ہوئی۔ جس میں ہیروئن نے چابک مار مار کر ویلین کی دھجیاں بکھیر دیں اور کمند اصفہانی میں ڈال کر شفاخانۂ ایرانی میں لے آئی اور رسی سے گھسیٹتے ہوئے ویلین کو ڈاکٹر کے قدموں میں ڈال کر بولی "نکالو اس کی رگوں سے خون اور بچالو میرے ہیرو کی ماں کو۔ بولو کیسی کہانی ہے؟"

دلاور نے یکایک کانچ کا گلاس زور سے دیوار پر دے مارا اور شکستہ کانچ کے جھناکے کے ساتھ خود بھی خاموش ہوگیا۔

میں نے دیکھا، سارے کمرے میں سناٹا تھا۔ ایک کونے میں تپائی ٹوٹی پڑی تھی۔ دوسرے کونے میں کانچ کے گلاس کے ٹکڑے پڑے تھے۔ تیسرے کونے میں مس آرادھنا کا چہرہ ویلین کی لڑائی کے تصور سے سُرخ تھا اور دونوں ڈسٹری بیوٹر کہانی کے تاثر سے چیخ نکلنے کی ایک، کمزور سی کوشش کر رہے تھے۔ موٹو بھائی نے کہا۔ "مگر یہ تم نے کہانی کا شروع سنایا۔ پھر آخر سنایا۔ بیچ کا حصہ تو سنا ہی نہیں!"

"وہ کانٹریکٹ کے بعد" دلاور نے موٹو بھائی کو دھکاتے ہوئے کہا "پہلے کانٹریکٹ کرو۔ چھ ہزار کا۔ تین سو ابھی ایڈوانس۔ پھر آگے بات کرو۔ جی جناب ایسی کچی گولیاں ہم نہیں کھیلتے ہیں۔ ساری کہانی ایک دم سنادیں"، دلاور نے فاتح مرغ کی طرح سینہ پھلا کر چاروں طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ بینگ۔ بینگ۔ فینٹنگ۔!"

پکچر کے سلسلے میں جب ہم تین سو روپے کا ایڈوانس لے کر شری راؤنڈ اسٹوڈیو سے باہر نکلے تو میں نے دلاور سے پوچھا " اچھا! مجھے کم از کم اتنا تو بتا دو، یہ بینگ بینگ فیٹنگ، دھوم دھڑام، دھڑاکا فڑدں فڑمیں، فناٹچ، گھمسان غٹرد پچ۔ دکان پھاڑتا۔ آنکھوں میں ڈنڈا دینا وغیرہ وغیرہ کس زبان کے الفاظ ہیں جن کی مدد سے تم نے یہ کہانی بیچی ہے۔ میں نے تو آج تک کسی ڈکشنری میں یہ الفاظ اور محاورے نہیں دیکھے؟"

" اے احمق! گاڈ دی، خرناتمام" دلاور نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا اگر ڈکشنری کے الفاظ کی مدد سے کہانی بک سکتی ہے تو آج دس سال سے تو اس انڈسٹری میں کیوں جھک مار رہا ہے؟ چل فرنانڈیز کی خفیہ بار میں آج تازہ کلیجی کے تکے کھائیں گے اور بھٹی کی پہلی دھار کا ٹھرّا پئیں گے"



ویلیو

چونی بھائی نہ اولڈ یاٹ کلب کے ممبر تھے نہ اولڈ بورین کلب کے
لیکن دونوں کلبوں میں بڑی محبت اور تکریم سے بلائے جاتے تھے اور اب
مسلسل دو سال سے یعنی جب سے ان کے چھوٹے بھائی کا تقرر بطور انکم
ٹیکس کمشنر ہوا تھا دہ کلب کی ہر بڑی محفل میں بطور ایک معزز مہمان کے
ضرور شرکت کرتے تھے۔ اس کے لئے انہیں کسی قسم کا تردد نہیں کرنا
پڑتا تھا ہر روز خود بخود دعوت نامے ان کے پاس پہنچ جاتے تھے
آج کھیم جی کلیان جی نے ان کی سالگرہ کے اعزاز میں کلب میں پچیس
دوستوں کو بلا رکھا ہے تو کل سینڈرڈ پلاسٹک مل کے مالک سیٹھ دولت
رام بانگا نے اپنی مل کا نیا سیکشن کھل جانے کی خوشی میں ایک پارٹی دی
ہے جس میں شرکت کرنے کے لئے سیٹھ بانگا نے چونی بھائی کو ذاتی طور
پہ پانچ بار کہا ہے۔ پرسوں رانی ہیرا بائی جہاد نگر کے بوفے اور ڈانس میں

چونی بھائی کو مدعو کیا ہے اور دعوت نامہ خود رانی صاحبہ کی بڑی لڑکی کملا بائی
جھونکر نے اپنے ہاتھ سے چونی بھائی کے ہاتھ میں تھمایا تھا بلکہ چونی بھائی کا
ہاتھ دبا کر بڑے پیار اور اصرار اور ایک عجیب دلکش اور اسے اِٹھلا کر کہا
تھا۔ دیکھئے جی اگر آپ ہماری پارٹی میں نہیں آئے تو میں عمر بھر آپ سے
نہیں بولوں گی اور چونی بھائی کملا بائی کی دلکش مسکراہٹ اس کے ہاتھوں
کے نرم دباؤ اور اس کے گلے میں پڑے ہوئے یاقوتی ہار کی چکا چوند سے
ایک پالتو کتے کی طرح اپنے فقرے کی دُم ہلاتے ہوئے بولے۔
"کیوں نہیں آؤں گا جی ای ای میں تو جرور آؤں گا آ۔ آپ بلائیں
اور میں نہ آؤں اوں اوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے، اے اے جی، ای ای؟
یہ تو وہی مجمون ہو گیا۔ وہ آئیں گھر ہمارے کھدا کی کُدرت ہے کبھی
ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں ایں ایں جی ای ای"
چونی بھائی کو سب لوگ بھیا جی کہہ کر پکارتے تھے۔ چاہے لوگ
ان سے عمر میں چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں، سب برابر انہیں بھیا
جی کہہ کر پکارتے تھے اور ہر محفل میں ان کی یکساں عزت ہوتی تھی
اور ان کی عزت ایک خاص رکھ رکھاؤ سے ہوتی تھی جیسے ہر محفل کے
مہمان خصوصی وہی ہوں، اب تو ہر ایک کو معلوم ہو چکا تھا کہ بھیا جی
عورتوں کی محفل میں بہت جھکتے ہیں۔ کلب کے ممبروں کے الفاظ میں

انہیں عورتوں کی کمپنی بہت پسند ہے۔ اس لئے ہر محفل میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ ان کی سیٹ ایسی جگہ پر رکھی جاتی جس کے اردگرد دو چار خوش شکل اور خوش مزاج عورتیں ضرور بیٹھی ہوں یوں بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ چرنی بھائی کے سامنے بدمزاج سے بدمزاج حسینہ بھی یوں پوری بتیسی کھول کر مسکرانے لگتی ہے جیسے اس کے سامنے چرنی بھائی نہ بیٹھے ہوں بلکہ بیش قیمت ڈائمنڈ کا ایک سیٹ رکھا ہو۔ بھیا جی یوں تو صوبہ گجرات کے رہنے والے تھے لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصّہ شمالی ہند کی ایک فرم میں اکاؤنٹنسی کرتے گزرا تھا جہاں سے وہ آخر میں حساب کتاب میں کوئی شدید گڑبڑ ہو جانے کی وجہ سے نکالے گئے تھے، اب دو سال سے بمبئی میں مقیم تھے اور اپنے سانتا کروز کے آبائی گھر میں رہتے تھے کیا کرتے تھے یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ البتہ گذشتہ دو سال سے برابر یہ کلب میں دیکھے جاتے تھے۔ ان کا قد ناٹا، جسم دبلا اور آواز بیٹھی ہوئی تھی اور وہ اپنی ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں سے لگڑ بگڑ کی طرح چلتے تھے لیکن کلب کے ممبروں کو ان کی یہ بے ہنگم چال بھی پسند تھی اور کنور بلدیو سنگھ نے ایک بار ان کی چال کو سراہتے ہوئے کہا تھا۔

"بھیا جی۔ آپ نے کیا شاہانہ چال پائی ہے میں سمجھتا ہوں آپ ضرور پچھلے جنم میں کوئی راجہ ہوں گے۔ ایک کنور سے اپنی چال کی یہ تعریف سُن کر بھیا جی خوشی میں آپے سے باہر ہو گئے تھے اور دوسرے دن اپنی ٹانگوں کو

اور بھی پھیلا پھیلا کر چلنے لگتے تھے، یہ صورت حال تھی تو مضحکہ خیز لیکن بھیا جی لوگوں میں اس قدر مقبول تھے کہ کسی کو آج تک ان پر ہنسنے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ شروع میں آج سے دو سال پہلے دو ایک لوگوں نے ان کی موجودگی پر ناک بھوں چڑھائی تھی لیکن جونہی انہیں معلوم ہوا کہ بھیا جی کا چھوٹا بھائی انکم ٹیکس کمشنر ہے انہوں نے فوراً اپنا روّیہ تبدیل کر لیا اور بھیا جی سے اس طرح ہنستے بولنے لگے جیسے وہ ان کے اپنے ہی گھر کے ایک معزز رکن ہوں۔ شروع شروع میں کلب کے اندر داخل ہوتے ہی ان سے پوچھا جاتا تھا۔ آپ ممبر ہیں تو کارڈ دکھائیے۔ مہمان ہیں تو اپنے میزبان کا نام بتلائیے۔ مگر اب ان سے کسی قسم کی باز پرس نہ ہوتی تھی بلکہ نام پوچھنے والا سٹیوارڈ اب انہیں جھک کر فرشی سلام کرنے لگا تھا۔

بھیا جی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ شمالی ہند میں متواتر پچیس سال رہنے سے انہیں اردو شاعری سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا بلکہ کلب میں آنے کے بعد خود بھی شاعر بن گئے تھے شروع شروع میں انہوں نے غالبؔ، مومنؔ، ناسخؔ، داغؔ کے اشعار غالب، مومن، ناسخ داغ کے نام سے سناتے تھے اب ہر شاعر کا کلام اپنے نام سے سناتے تھے کیونکہ انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ سمینٹ، پلاسٹک اور لوہا

بیچنے والے لکھ پتی لوگوں کے لئے یہ نام بالکل اجنبی ہیں۔ جن لوگوں نے آج تک اپنی پاس بُک کے سوا اور کوئی کتاب نہ پڑھی ہو ان کے سامنے شاعر بن جانا کونسا بڑا ظلم ہے؟ پھر جن لوگوں نے زندگی بھر انکم ٹیکس کی چوری کی ہو وہ چند شعروں کی چوری پر بھلا کیوں اعتراض کریں گے۔ اس لئے کلب کے جو ممبر پڑھے لکھے بھی تھے وہ بھی انتہائی ذوق شوق سے بھیا جی سے ان کا تازہ کلام سنتے تھے اور بڑھ بڑھ کر داد دیتے تھے۔

شاعری کے علاوہ بھیا جی ایک بہت بڑے مزاح نگار تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے دو تین تازہ لطیفے ضرور سناتے جس پر محفل میں وہ بلند بانگ قہقہے بلند ہوتے کہ بھیا جی خود اپنی فراستِ طبع پر حیران ہونے لگتے۔ آہستہ آہستہ ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے انہیں یقین دلایا کہ وہ بہترین لطیفہ گو اور شاعر ہیں اور یہی ان کی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے وہ ہر محفل کی جان ہوتے ہیں چنانچہ اب ہر ماہ بڑی پابندی سے انگریزی جوک بک اور دوسرے لطیفوں کی کتابیں خریدتے تھے اور ان سے لطیفے یاد کر کے کلب میں سناتے تھے اسی طرح انہوں نے اپنے ہمسائے امیر علی بیکس سے دوستی کر رکھی تھی جو خود ایک شاعر تھا اور جس کے پاس اردو زبان کے بہت سے رسالے آتے تھے ہر روز صبح

سیر کرتے ہوئے بھیا جی امیر علی کے مکان پر پہنچ جاتے تھے اور اس سے اچھے اچھے شعر سُن کر نقل کر لیتے تھے اور پھر کلب میں آکر سناتے تھے ساری زندگی آنے پائیاں گنتے گنتے اور اپنے باس کی گھڑکیاں دھمکیاں اور جھڑکیاں سہتے سہتے بھیا جی کی زندگی میں اب یہ موقع آیا تھا جب انہیں احساس ہوا کہ وہ ممتاز سماج کے ممتاز رکن ہیں اور اپنی ہمہ گیر خوبصورت شخصیت کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ کاش انہیں پہلے سے معلوم ہوتا کہ وہ اتنی خوبیوں کے مالک ہیں تو وہ اکاؤنٹنسی کیوں کرتے کسی بزنس میں پڑ کر آج تک لکھ پتی کیوں نہ بن گئے۔

کلب کی پہلی منزل کے مین لاؤنج میں سیٹھ بانگا کی پارٹی زوروں پر تھی۔ جب بھیا جی سفید ململ کے مہین دھوتی پر سیپ کے بٹنوں والی سفید اچکن پہنے ہوئے مسکراتے ہوئے لگڑ بگڑ کی چال چلتے ہوئے داخل ہوئے ان کے داخل ہوتے ہی لاؤنج میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔

"یہاں آئیے بھیا جی"

"نہیں یہاں بیٹھئیے۔"

"میرے پاس"

"نہیں ہمارے پاس"

"دیکھئے میں کب سے آپ کی راہ تک رہی ہوں"
رانی ہیرا بائی جڑاؤ نکر اپنے نیلم کے بیش قیمت آویزے
جھلاتے ہوئے بولی۔

بھیا جی کا دبلا پتلا جسم فخر و مسرت سے ایک۔ کمان کی طرح
تن گیا۔ انہوں نے پوری پارٹی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر رانی
ہیرا بائی اور نیلوفر اور مسز جگن بھائی لیوا ساکی کرسیوں کے بیچ کی ایک
کرسی پر جا بیٹھے اور ہنسنے لگے ،، بھئی کمال ہے ۔ جانے بھیا جی میں
کیا گن ہیں ۔
عورتیں تو ان پر گرتی ہیں ۔ ہمیں تو کوئی پوچھتا ہی نہیں ۔،،
"راجہ اندر سے کوئی منتر سیکھ کے آئے ہیں ،، پرنس فیروز نے رشک
آمیز لہجے میں، اس طرح بلند آواز میں کہا کہ سب ہنسنے لگے سب سے
اونچی ہنسی خود بھیا جی کی تھی۔
"کونسی وہسکی پئیں گے ،، سیٹھ بانگا نے خود آکر بھیا جی سے پوچھا
راج کماری کملا بائی نے مشورہ دیا۔ ،، دیکھئے میں شمپین پی رہی
ہوں ۔ آپ بھی پی لیجئے ۔،،
"اچھا صاحب ! ہم بھی شمپین ہی پئیں گے۔ بھیا جی کملا بائی کی
طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولے ۔

بھیا جی کیلئے اسی وقت شمپین آگئی۔ مس نیلوفر نے ذرا جھک کر بھیا جی کے اچکن کے بٹن دیکھے انہیں چھو کر بولی۔

"موتیوں کے بٹن معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی نہیں" بھیا جی نے اقرار کیا یہ تو سیپ کے بٹن ہیں۔"

"سیپ کے بٹن ہیں؟ ہرگز نہیں۔ رانی ہیرا بائی جھاڑ کر بولیں "مجھے تو موتی کے معلوم ہوتے ہیں۔"

سیٹھ اگر چند جوہری اپنی سیٹ سے اٹھ کر بھیا جی کے قریب آگئے۔ غور سے انہوں نے سیپ کے بٹن دیکھ کر اور انہیں چھو کر کہا "استاد ہمیں بناتی ہو یہ تو عدن کے موتی ہیں خالص موتی ہیں۔ اور تم انہیں سیپ کا بناتی ہو۔ ہم نے کیا بیس برس جوہری رہ کر بھاڑ جھونکا ہے۔؟"

بھیا جی ایک پر اسرار مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لے آئے مگر منہ سے کچھ نہیں بولے۔

اب اگر ان لوگوں کو غلط فہمی ہو رہی ہے تو میں اپنا بھرم کیوں نہ رکھ لوں؟ انہوں نے سوچا اور سوچ کر شمپین کا ایک بہت بڑا گھونٹ پی لیا اور رانی ہیرا بائی کی طرف مخاطب ہو کر بولے "آج کا تازہ لطیفہ سنا؟"

"نہیں۔"

"بڑے مجے کا ہے۔"

"ضرور سنائیے۔"

"بھیا جی نے ادھر اُدھر دیکھا اور جب چار پانچ اور لوگوں نے بھی لطیفہ سننے پر آمادگی ظاہر کی تو بولے ڈاکٹر مہتہ جرا یہ لطیفہ سننا۔ بڑے مجے کا جوک ہے"

ڈاکٹر مہتہ فوراً ہمہ تن گوش ہو گئے تو بھیا جی نے لطیفہ سنانا شروع کیا۔

ایک کوئی ڈاکٹر تھا اپنے یا ٹپیں کی طرح وہ ایک دن ایک مریض کے گھر پہنچا تو اس کے مریض نے گھبرا کر کہا "ڈاکٹر صاحب اس گھر میں سب لوگوں کو ٹائی فائیڈ ہونے والا ہے۔" جب ڈاکٹر صاحب نے بولا "وہ کیسے تو مریض بولا۔ وہ ایسے کہ میرے بیٹے نے میری نوکرانی کے منہ پر پیار کر لیا ہے" تو ڈاکٹر بولا اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔" تو مریض بولا "گھبرانے کی بات یہ ہے کہ میں نے بھی اسی نوکرانی کے منہ پر پیار کر لیا ہے" تو ڈاکٹر بولا "ہاں یہ ذرا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ کیونکہ اب تم کو بھی ٹائیفائیڈ ہو سکتا ہے۔ مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے اس پر وہ مریض بولا کہ ڈاکٹر صاحب قصہ یہ ہے کہ نوکرانی کا پیار کرتے

کے بعد میں نے اپنی عورت کے منہ پر پیار کر لیا۔ تو ڈاکٹر ایک دم گھبرا کر بولا تب تو بہت بُری بات ہوئی کیونکہ اب مجھ کو بھی ٹائیفائیڈ ہو جائے گا۔

ہا ہا !!

ہا ہا ہا !!

ہا ہا ہا ہا !!!

چاروں طرف تحسین کا ڈونگرا برس گیا۔ فوراً ہی بھیا جی نے کسی فرمائش کے بغیر دوسرا لطیفہ سنانا شروع کر دیا۔

ایک خصم تھا۔ ایک بیوی تھی۔ بیوی بہت خوبصورت تھی خصم کو اپنی بیوی پر شبہ تھا کہ وہ ادھر اُدھر ضرور جاتی ہے مگر اس کو کوئی ثبوت نہیں ملتا تھا اس لئے وہ ایک روج پندرہ روج کے لئے شہر سے باہر چلا گیا اور جاتے وقت اپنے دوست سے کہہ گیا کہ مجھ کو اپنی بیوی پر شبہ ہے تم ذرا اس کا دھیان رکھنا اس کا پیچھا کرنا اور دیکھنا کہ وہ ادھر اُدھر کہاں جاتی ہے ؛ میں اس کی بد معاشی کا اصلی ثبوت چاہتا ہوں

اس کے دوست نے حامی بھر لی اور وہ چلا گیا اور پندرہ روج کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے اپنے دوست سے پوچھا تم نے کیا دیکھا ؟ تو اس کا دوست بولا۔

"میں نے دیکھا کہ تمہارے جانے کے دو گھنٹے بعد ہی ایک بہت
خوبصورت نوجوان تمہاری بیوی کے پاس آیا اور تمہاری بیوی نے
بہت خوبصورت کپڑے پہنے اور اس کے ساتھ ایک کلب میں چلی گئی
میں بھی چلا گیا وہاں پر ان دونوں نے ڈرنک لیا اور ڈانس کیا پھر وہ
دوسرے کلب میں گئے وہاں بھی انہوں نے ڈرنک لیا اور ڈانس کیا۔
پھر وہ تیسرے کلب میں گئے۔ وہاں بھی ان لوگوں نے ڈرنک لیا، ڈانس
کیا۔ اب رات کے تین بج چکے تھے اب وہ دونوں تمہارے گھر گئے میں
بھی چپکے سے اندر چلا گیا وہ دونوں تمہارے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے
اور دروازہ اندر سے بند ہو گیا اور میں آگے کچھ نہیں دیکھ سکا۔"

خصم ہاتھ ہلا کر بولا "یہی تو مصیبت ہے اصلی ثبوت تو پھر بھی
نہ ملا۔

ہا ہا!

ہا ہا!!

ہا ہا ہا!!!

"بھیا جی! بھیا جی۔۔ رانی میرا بائی کچھ شرما کر کچھ گھبرا کر اور کچھ بن کر
بولیں۔

تم بڑے شریر ہو، تم بڑے شریر ہو"

یہ کہہ کر انہوں نے پیار بھری سرزنش سے بھیا جی کے ہاتھ پر ایک دھپ سا دیا اور بولیں "اب ہم تمہارے لطیفے نہیں سنیں گے اپنا تازہ کلام سناؤ بڑھیا والا"۔

بھیا جی نے فوراً پہلو بدلا اور کھنکار کر بولے،

"سنورانی آج ہی یہ غزل کہی ہے۔"

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

"واہ! واہ!! کنور بلدیو سنگھ لہرا کر بولے۔ "دلِ ناداں کا جواب نہیں"، کنور بلدیو سنگھ نے سیٹھ ہیرا نند کی طرف مڑ کر کہا جن کے بمبئی میں بیس کے قریب ڈرگ سٹور تھے اور جو بمبئی میں انگریزی دوائیوں کی تجارت کے سب سے بڑے سوداگر سمجھے جاتے تھے "کچھ سمجھے آپ"؟ سیٹھ ہیرا نند ذرا بہرے تھے اس لئے کنور بلدیو سنگھ کے چلانے پر ذرا چونک کر بولے۔

"بھیا جی یہ گیت پھر پڑھنا! کنور بلدیو سنگھ اس کا مطلب مجھ سے پوچھتے ہیں"۔

بھیا جی نے اسی تصرف کے ساتھ پھر پڑھا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

بہت آسان شعر ہے "، سیٹھ ہیرا نند کنور بلدیو سنگھ کو سمجھاتے ہوتے بولے،، ڈاکٹر بولتا ہے اے مریض تجھ کو کیا ہوا ہے ؟ مریض کہتا ہے آکھر اس درد کی دوا کیا ہے؟ اس پر ڈاکٹر کہتا ہے "مِن ناراں"

"مگر مِن ناران کیا ہے سیٹھ جی"، کنور بلدیو سنگھ نے پھر پوچھا۔"

"میرے خیال میں کوئی اس زمانے کی پیٹنٹ دوا ہوگی! کیوں بھیا جی ؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہو"، بھیا جی نے سر ہلا کر کہا اور آگے پڑھنے لگے:

"عرج کرتا ہوں"

میں بھی منہ میں جباں رکھتا ہوں
کاس پوچھو کہ ماںگتا کیا ہے!

کنور بلدیو سنگھ صاحب کے اپنے بائیں بازو بیٹھے ہوئے سیٹھ سکھانند سے پوچھا جو سیٹھ ہیرا نند کے چھوٹے بھائی تھے اور جو اس وقت بھیا جی کے شعروں پر سب سے زیادہ سر ہلا رہے تھے "کیوں سیٹھ سکھانند جی اس شعر کا مطلب کیا ہے اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔"

سیٹھ سکھا نند جی ۔کنور بلدیو کو سمجھانے لگے ۔ بہت سرل اور سیدھا سادھا ہے،
کنور جی! شاعر منہ میں جبان رکھتا ہے اور کچھ مانگتا ہے اب تم بوجھو
کہ وہ کوئی جو منہ میں جبان رکھتا ہے کیا مانگ سکتا ہے"۔

"کیا مانگتا ہے ؟ کنور جی نے پوچھا۔

"روٹی ! سکھا نند نے فاتحانہ انداز سے شعر کا عقدہ حل کرتے ہوئے
کنور جی سے کہا۔

کنور بلدیو سنگھ نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ابھی بھیا جی غالب کے تیسرے
شعر کا تیا پانچہ کرنے والے تھے کہ رانی ہیرا بائی جھاؤ نگر انہیں محفل سے اٹھا
کر ایک طرف لے گئیں۔

"آپ سے ایک کام ہے بھیّا جی"

"فرمایئے رانی جی"

"وہ میرے حساب کتاب میں بڑی گڑ بڑ ہے ۔میرا اکاؤنٹنٹ نہایت ہی
احمق ہے ۔بھگوان جانے کیسے حساب جوڑتا ہے کہ ہر سال انکم ٹیکس گھٹنے کی بجائے
بڑھتا ہی چلا جاتا ہے میں چاہتی ہوں اس سال بھی آپ میرا حساب کتاب
ٹھیک کردیں۔ ویسے تو اس نے سب تیار کر کے رکھا ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ آپ
اُسے ٹھیک طرح سے دیکھ لیں۔ اس کام کے بیس تیس ہزار روپے آپ کو دوں گی
شروع کر دیجیئے"

"میں تو آپ کا داس ہوں رانی جی! بھیا جی مسکراتے ہوئے بولے۔
"آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا"۔

"پرسوں شام آپ میری کوٹھی پہ آجائیے گا۔ میں سمجھادوں گی اور پانچسو روپیہ ایڈوانس بھی دیدوں گی۔"

"اس کی کیا جرورت ہے رانی جی"

"اس کی ہر ایک کو ضرورت ہوتی ہے بھیّا جی"!

اتنے میں ایک کونے میں بھیا جی اور رانی جی کو بات کرتے دیکھ کر مس نیلوفر چلّائیں "ارے بھیا جی۔ وہاں کب سے کھڑے کیا میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہو رانی جی سے؟ اپنے سب حقوق اسی کے نام مت لکھ دو کچھ ہمارے لئے بھی رہنے دو، ادھر آؤ۔؟"

بھیا جی مسکراتے ہوئے مس نیلوفر کی طرف روانہ ہوئے سلیقڈ اٹین والا چلا کر بولے "کیوں پرنس فیروز بھیا جی میں کیا بات ہے ہر وقت خوبصورت عورتیں اسے گھیرے رہتی ہیں۔"

"صاحب ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا" پرنس فیروز ایک لمبے سگار سے راکھ جھاڑتے ہوئے بولے، "اب تک تو سن رکھا تھا کہ خوبصورت عورت مربے کا ڈبہ ہوتی ہے جس کے گرد مرد چیونٹیوں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں مگر یہاں تو مربے کا ڈبہ عورت کی بجائے ایک مرد ہے۔" "ہی از اے ڈارلنگ"

مس نیلوفر نے پیار بھری نظروں سے بھیا جی کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح کہا کہ ساری محفل لوٹ پوٹ ہو گئی

جب پارٹی عین شباب پر تھی تو سیٹھ اٹین والا نے اعلان کیا۔ کل سہ پہر پر انہوں نے دہار جھیل پر ایک شاندار پک نک کا انتظام کیا ہے دن میں مچھلیاں پکڑی

جائیں گی اور رات کو قوالی ہوگی۔

"مچھلیاں رات کو کیوں نہیں پکڑ سکتے؟" نوجوان نکھد بتی نے نیلوفر کی آنکھوں میں جھانک کر معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پھسل جاتی ہیں۔ نیلوفر اپنی آنکھوں کے آگے شمپین کا جام مدکر ستی سے بولی پھر اس کے ہونٹ شمپین میں ڈوب گئے اور ستی سوچنے لگا۔ یہ شمپین میں بھیگے ہوئے گلابی ہونٹ کتنے پتلے اور باریک کٹے ہوئے ہیں۔ نیلوفر کس مشاقی سے ہلکا سا لپ سٹک لگاتی ہے کہ ہونٹوں کا ہر خم واضح ہو کر ابھر آتا ہے آج کل کی عورتیں خود ہی تصویر ہیں خود ہی مصور ہیں خود ہی مچھلی اور خود ہی ماہی گیر۔

"ارے بھیا جی کا گلاس خالی ہے! شمپین لاؤ"۔ سیٹھ ڈمٹن والا چلا کر بولے پھر خود اپنے ہاتھ سے بھیا جی کو جام دیتے ہوئے بولے۔

کل شام آپ ضرور آئیں گے؟

آؤں گا اور ایک کوالی بھی لکھ کر لاؤں گا" بھیا جی شمپین کا ساتواں گلاس چڑھاتے ہوئے

آپ یہیں کلب میں آجانا۔ میں آپ کو اپنی سٹیشن ویگن پر لے جاؤں گا۔

ٹھیک ہے" بھیا جی اطمینان سے سر ہلاتے ہوئے بولے

دوسرے دن سہ پہر سے ایک گھنٹہ قبل ہی بھیا جی کلب کے مین لاؤنج میں ایک کونے میں بیٹھے ہوئے پائے گئے انہوں نے پرنس فیروز کو اپنے قریب سے گذرتے ہوئے دیکھا۔ "پرنس پیروج! آؤ تم کو نیا جوک سناؤں ایک تھا بیل بنیا کالی بنیں بیچا کرتا تھا۔" کالی کیوں بیچتا تھا۔" پرنس فیروز نے عجز کے کہا

اودی کیوں نہیں بجتا تھا؟ نیلی کیوں نہیں بجتا تھا۔ پیلی کیوں نہیں بجتا تھا۔

چونی بھائی ایک دم چونک گئے آج تک پرنس فیروز نے ان سے اس طرح کبھی بات نہیں کی تھی مگر وہ سادہ مزاج تھے اس لئے طرح دے گئے۔ ہنس کر بولے "یار تم پورا جوک تو سنو۔"

"یار؟ کون یار؟ کس کا یار؟" پرنس فیروز نے بھڑک کر کہا۔ "معاف کیجئے گا چونی بھائی۔ میں اس قسم کی بے تکلفی پسند نہیں کرتا۔"

یہ کہہ کر پرنس فیروز وہاں سے چلے گئے اور چونی بھائی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر آدمی موٹی کھال کے تھے چند لمحوں کے بعد انہوں نے کنور بلدیو سنگھ کو گھیر لیا۔

"کنور جی میں نے آج کے فنکشن کے لئے نئی قوالی لکھی ہے۔ ذرا سنئے عرض کیا ہے۔"

"معاف کیجئے بھیا جی مجھے اس وقت فرصت نہیں ہے۔" کنور بلدیو سنگھ تنک کر بولے۔ "اور پھر میں — آپ کی قوالی سن کر کیا کروں؟ نہ اس میں وزن ہوتا ہے، نہ قافیہ درست، نہ شعر ٹھیک، نہ زبان، نہ محاورہ نہ روزمرہ جیسی آپ کی قوالی۔ ویسے آپ کے جوک میں سخت بور ہو چکا ہوں آپ سے" اتنا کہہ کر کنور بلدیو سنگھ انتہائی متعفن اور بے زار سا چہرہ لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

بھیا جی کا دماغ بھنا گیا کسی نے آج کلب میں ان کی اس طرح

بے عزتی نہیں کی تھی۔ پہلے پرنس فیروز پھر کنور بلدیو سنگھ جا نے ان لوگوں کو آج ہوا کیا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد انہیں رانی ہیرا بائی جھاؤ نکر اپنی طرف آتی دکھائی دی بھیا جی اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے فخر و مسرت سے تن گئے اور اتنے تنے کہ انہیں اُٹھ کر رانی جی کو تعظیم دینا بھی یاد نہیں رہا۔ مگر رانی ہیرا بائی ان کے پاس آکر زیادہ دیر کے لئے نہیں رُکیں۔ جلدی جلدی بولتے ہوئے کہنے لگیں کل شام کو آپ مت آیئے گا۔ میں ذرا ایک ضروری کام سے بمبئی سے باہر جا رہی ہوں دو ایک دن کے بعد لوٹوں گی۔

"تو میں دو دن کے بعد آجاؤں گا"

"اس کی ضرورت نہیں ہے، میں خود واپسی پر فون کر دوں گی آپ خواہ مخواہ تکلیف نہ کریں۔ بائی بائی"!

اتنا کہہ کر رانی جھاؤنکر بھی تیزی سے پلٹیں اور لاؤنج کے دوسرے کونے میں چلی گئیں تھوڑی دیر کے بعد جب سیٹھ اٹن والا لاؤنج میں داخل ہوئے تو انہوں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ لوگ مختلف ٹکڑیوں میں مختلف کونوں میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ سیٹھ والا نے طائرانہ نگاہوں سے اپنے دوستوں کا جائزہ لیا جن کو وہ اپنے ساتھ پک نک پر لے جانے والے تھے۔

"ارے بھئی تیار ہو جاؤ۔ سب سامان تو ہو گیا بس آپ کو لینے آیا ہوں کنور جی پرنس صاحب، سیٹھ بانگا سکھانند۔ ہیرا نند جی۔ نظر دان جی۔

کملا بیٹی ۔ مس نیلوفر ۔ مس رضیہ ۔ ۔ ۔

سیٹھ ابٹن والا ایک ایک کا نام لے کر بلانے لگے اور لوگوں کو اکٹھا کر کے کلب سے باہر گاڑیوں میں بھجوانے لگے ۔ دو تین بار وہ چونی بھائی کی کرسی کے قریب سے گذر گئے ۔ ان کی نظر بھیا جی پر نہیں پڑی ۔ حالانکہ دو تین بار بھیا جی نے ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا مگر ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

بے چارہ سیٹھ کس قدر مصروف ہے ۔ چونی بھائی نے ہمدردی کے لہجے میں اپنے آپ سے کہا اور پھر خود ہی اٹھ کر انہوں نے دو تین بار سیٹھ ابٹن والا کے گرد چکر کاٹے مگر سیٹھ اس قدر مصروف تھا کہ ان کی طرف متوجہ بھی نہ ہو سکا آخر جب لاؤنج سے بہت سے آدمی نکل گئے اور صرف دو تین آدمی رہ گئے تو بھیا جی نے آخر سیٹھ ابٹن والا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”میں تو آپ کی سٹیشن ویگن میں جاؤں گا ناں “ بھیا جی نے سیٹھ سے پوچھا

” اوہ ساری “ سیٹھ ابٹن والا نے بڑی رکھائی سے کہا ۔ میری سٹیشن ویگن میں تو اب جگہ ہی نہیں ہے ۔ ۔ ۔

اے پاکسی سیٹھ ، دوسری طرف پلٹ کر بولا ۔ ” پاکسی دیکھنا سب لیڈیز گاڑیوں میں بیٹھ گئیں ۔ ذرا چیک اپ کر لو ۔ میں ذرا بیئر چیک اپ کر لوں ۔ سیٹھ ابٹن والا اپنے دو تین ساتھیوں کو ساتھ لے کر لاؤنج سے باہر نکل گئے “!

اب لاؤنج کے اندر بکمل سناٹا تھا اتفاق سے ایک بھی ممبر موجود نہ تھا

سٹیوارڈ اپنے اسسٹنٹ کو لئے ایک کھڑکی میں کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ چونی بھائی مہتہ حیران و پریشان ہو کر ایک کونے میں ایک میز کے کنارے بیٹھ گئے اور اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگے۔

اسسٹنٹ نے سٹیوارڈ سے پوچھا۔

کیا بات ہے آج بھیا جی کو کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے کوئی ان سے ٹھیک طرح سے باتیں نہیں کرتا آج وہ کلب میں اکیلے بیٹھے ہیں۔

"احمق! کیا تم جانتے نہیں ہو۔ ایک طنز آمیز نگاہ سے بھیا جی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا جو دور ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھے تھے" آج بھیا جی کے چھوٹے بھائی کا ٹرانسفر ہو گیا ہے"

"کون وہ جو انکم ٹیکس کمشنر تھا؟"

"ہاں! آج اس کا تبادلہ بمبئی سے دہلی ہو گیا ہے"

"یہ بات؟ اسسٹنٹ ہولے ہولے سیٹی بجانے لگا۔

بھیا جی نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر اپنا دماغی توازن ٹھیک کرنے کے لئے جلدی سے ایک بیرے کو بلایا اور بولے۔

"سکاچ کا ایک بڑا پیگ لاؤ"

"کس کے حساب میں جناب" بیرے نے پوچھا۔ "آپ تو ممبر نہیں ہیں"

بھیا جی چونک گئے اور چونک کر بھڑک گئے اور ذرا غصے میں بولے "کسی کے حساب میں لاؤ، روز تو لاتے ہو اور آج پوچھتے ہو کس کے حساب میں۔ جاؤ کسی کے حساب میں لاؤ پرنس کے، ٹھاکور کے، سیٹھ اُتم رام کے

کسی کے حساب میں ڈال کر لاؤ۔"

"آج سے آرڈر نہیں ہے صاحب!

"کیا کہا" ببیا گرج کر بولے اور کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے

"آج سے آرڈر نہیں ہے صاحب"، بیرہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے سر جھکا کر آہستہ سے بولا۔

کچھ دیر تک چونی بھائی چپ چاپ حیرت سے کھڑے بیرے کو دیکھتے رہے پھر جیسے ان کی سمجھ میں آگیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور انہوں نے جلدی سے اپنا سر جھکا لیا اور تیز تیز سے قدموں سے چلتے ہوئے کلب کے باہر چلے گئے۔

اور اس دن کے بعد وہ کبھی بورین کلب میں نہیں دیکھے گئے پھر کبھی انہیں اس گھر کا راستہ نہ ملا۔



پشتی نامرد

میں آٹھ نومبر ۱۹۴۶ء میں ناسک شہر میں پیدا ہوا۔ لیکن مجھے وہاں رہنے کا بہت کم موقع ملا ہے۔ میں ایک آوارہ گرد سیلانی ہوں۔ گاؤں گاؤں شہر شہر گھومتا ہوں اور سدا چکر میں رہتا ہوں جہاں جاتا ہوں لوگ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور مسکراتے ہوئے چہروں سے میرا استقبال کرتے ہیں۔ اس دنیا میں میرا کوئی دشمن نہیں ہے سب دوست ہیں۔ سب مجھے دل سے چاہتے ہیں۔ میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ سیکھا ہے کھویا ہے۔ لیکن اپنی زندگی کے ان گنت تجربوں کے باوجود ایک بات میں بے کھٹکے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی چھوٹی سی زندگی میں، میں نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی ہے وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے آج تک کسی بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر یا فلم اسٹار کو بھی وہ شہرت اور مقبولیت نہیں ملی جو مجھے مل چکی ہے۔ بچہ بچہ مجھے جانتا ہے پہچانتا ہے اور مجھ سے محبت کرتا ہے۔

میں دس روپے کا نوٹ ہوں۔

کئی ماہ تک میں مشہور فلم اسٹار شہزادی کے ڈرائنگ روم میں مکڑ بابا کی

تصویر کے فریم کے گرد نوٹوں کے ہار میں ٹنگا رہا۔ شہزادی، لکڑ بابا کو بہت مانتی تھی اور اس نے دس دس کے نوٹوں کو لے کر پانچ سو روپے کا ہار لکڑ بابا کی تصویر کے گرد لٹکا دیا تھا۔ شہزادی کا سب سے چھوٹا بھائی رجو دراصل اس کا بھائی نہیں، بھتیجا تھا، گھر کے لوگ اسے پیار سے منّا کہتے تھے۔

یوں تو منّا کو اس کی ماں اور شہزادی دونوں پاکٹ منی دیتے تھے مگر منّا لاڈلے بچوں کی طرح بہت شاہ خرچ تھا۔ اب اس نے اپنی ماں بہن کے علاوہ لکڑ بابا سے بھی روپیہ نکالنے کا طریقہ ایجاد کر لیا تھا۔ وہ بہت ذہین بچہ تھا اور جب اس کی فضول خرچی روکنے کے لئے یا اسے سزا دینے کے لئے امی اور شہزادی اس کی پاکٹ منی روک دیتے یا پاکٹ منی جلد ختم ہو جاتی اور منّا کو مزید رقم کی ضرورت پڑتی تو وہ سب کی نظریں بچا کر ایک کرسی پر اسٹول رکھ کر کسی نہ کسی طرح لکڑ بابا کی تصویر تک پہنچ جاتا اور ہاتھ جوڑ کر کہتا "لکڑ بابا بھیل پوری کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ اگر بُرا نہ مانو تو تمہارے ہار میں سے ایک روپیہ لے لوں۔ ؟"

"لے لوں ؟" بس ایک روپیہ لوں گا۔ صرف ایک، اور پھر کبھی نہیں لوں گا اس پر منّا کو ایسا محسوس ہوتا جیسے لکڑ بابا تصویر میں سے جھانک کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں اور اسے ہار میں سے ایک روپیہ نکالنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس پر خاموش ہو کر وہ لکڑ بابا کی تصویر چوم لیتا اور ہار میں سے ایک روپیہ نکال کر چلا جاتا۔

مدتوں یہی عمل جاری رہا۔ کبھی بھیل پوری کے لئے بارہ مسالے کے لئے

کبھی آئس کریم کے لیے، کبھی غباروں کے لئے، کھلونوں کے لئے ۔ دوستوں کو قرض دینے کے لئے ۔ ۔ ۔ ایک روپے کے نوٹ ہار میں سے نکلتے رہے ۔

شروع شروع میں تو پتہ نہیں چلا ۔ پھر ہوتے ہوتے ہار خالی ہونا شروع ہوا ۔ بیچ بیچ میں سے گنجا ہونے لگا جیسے ہار پر پت جھڑ کا موسم آ چلا ہے ۔ ایک دن منا صاحب عین اس عالم میں پکڑے گئے جب وہ کرسی پر تپائی رکھ کر نوٹوں کے ہار سے مجھے نکال رہے تھے شہزادی کو بس سے پہلے تو گھر کے نوکروں پر شبہ تھا لیکن جب ایک نوکر شہزادی کو جلدی سے بلا کر لایا اور انہیں منا صاحب کو دکھایا تو شہزادی نے منا کو کرسی سے نیچے گھسیٹ کر دو ہاتھ لگائے نوٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر اپنے پرس میں ڈال لیا بلکہ سارا ہار ہی نوچ کر اس نے اپنے پرس میں ڈال لیا ۔

اس پر منا شہزادی کی گود میں لیٹا لیٹا ٹانگیں ہلا ہلا کر مچلنے لگا اور زور زور سے چیخنے چلانے لگا تو شہزادی نے اسے اور مارا، اور مارا، اتنا مارا کہ امی دوڑتی دوڑتی ڈرائنگ روم میں گھس آئیں اور بچے کو اس کی گود سے چھین کر غضب ناک آواز میں بولیں ۔ " ارے ۔ ۔ ۔ ارے یہ کیا کرتی ہو؟ اپنی ہی کوکھ کے جائے پر اتنا ظلم ڈھاتی ہو صرف دس روپوں کے لئے اپنے ہی بچے پر ؟ تمہیں شرم نہیں آتی ؟ "

کہنے کو تو امی جان نے غصے میں اتنا کہہ دیا مگر کہتے کہتے انہوں نے اپنی غلطی محسوس کر کے دانتوں تلے انگلی داب لی ۔ شہزادی نے بھی منہ پر انگلی رکھ کر

جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اتفاق سے اس وقت ڈرائنگ روم میں ماں بیٹی اور بچے کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ شہزادی کی جان میں جان آئی ماں شرمندہ ہو کے چپ تھیں، منّا ان کی چھاتی میں دبکا ہوا منہ چھپائے ہوئے تھا سارے کمرے میں سناٹا تھا۔ یکایک منّے نے سر اُٹھا کے شہزادی کی طرف دیکھا اور سسکتے سسکتے کہا "ہمیں دس روپے دیدو! نہیں تو ہم سب سے کہہ دیں گے کہ ہم امّی کے بیٹے نہیں ہیں ہم شہزادی کے بیٹے ہیں"

اپنی ماں سے دس روپے لے کر منّا اپنی نئی طاقت کے احساس سے سرشار اپنی نانی کی گود سے اُترا اور باہر بازار میں آئس کریم کھانے چلا گیا۔ اگر یہ اس کی زندگی کا پہلا بلیک میل تھا تو کیا ہوا، ابھی تو اس کی عمر صرف سات سال ہے۔

آئس کریم اینڈ ملک بار کی کاؤنٹر سے میں فیروزا اور خانم کے ساتھ کرایا گیا جو ملک بار سے آئس کریم کھا کر نکل رہے تھے۔ دکان سے باہر نکل کے خانم کو یاد آیا کہ ان کے علاقہ میں ونا سپتی گھی بھی بلیک میں چلا گیا ہے اس لئے انہوں نے قریب کے بنیئے کی دکان سے ونا سپتی گھی کا ایک ڈبہ خریدا۔ بنیئے کی دکان سے مجھے مسز ایڈل جی کے ہمراہ کر دیا گیا جس نے بنیئے کی دکان سے بہت سا سامان خریدا تھا۔ مسز ایڈل جی نے مجھے ایک بساطی کے حوالے کر دیا جس کی دکان سے انہوں نے اپنے ڈرائنگ روم کے لئے نئے پردوں کا کپڑا خریدا تھا۔ اسی بساطی کی دکان پر ابھی منظور کلرک اپنی بیوی بتول کے ہمراہ سیلز کاؤنٹر پر کھڑا اپنے گھر میں ہونے والی پہلی خوشی کے سلسلے میں کچھ ضروری کپڑے خرید

رہا تھا۔ بچے کے پوتڑوں، فراکوں اور ننھی ننھی رنگدار ٹوپیوں کے لئے کم،
اُن کے ساتھ میں شربت والے کی دکان پر آیا۔ کیونکہ بتول کو پیاس لگ رہی
تھی شربت والے نے مجھے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے سپرد کیا جس نے اس کی دکان
سے یکے بعد دیگرے شربت کے چار گلاس پیئے تھے اس ادھیڑ عمر کے آدمی
نے دکان سے باہر نکل کر قریب کے دوا فروش سے سر درد کی گولیوں کا ایک
پورا ڈبہ خریدا۔ اس ادھیڑ عمر کے آدمی کی صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ نہ
صرف اسے سدا سر درد رہتا ہے بلکہ خود اس کی ذات دنیا کے لئے مستقل
سر درد ہے۔ سر درد کی گولیاں خرید کے وہ ادھیڑ عمر کا آدمی ایک ٹیکسی پر سوار
ہوا اور اپنی منزل پر پہنچ کر اس نے مجھے ٹیکسی والے کے حوالے کیا
ٹیکسی والے نے پٹرول پمپ والے کو دیا۔ پٹرول پمپ والے نے ایک
ایک ایسے جوڑے کو دیا جنہوں نے پہلی بار موٹر خریدی تھی اور اس میں
بیٹھ کر سینما جا رہے تھے۔ سینما دیکھ کر میں ان کے ساتھ لوٹ رہا تھا کہ پھر
ایک پٹرول پمپ پر پہنچا دیا گیا جہاں سے میں غلام علی موٹر میکینک کی جیب
میں پہنچا۔ غلام علی مجھے لے کر بازار کے شدو حمام والے کے ہاں چلا گیا حمام
والے نے مجھے ایک حجام کے سپرد کیا۔ حجام نے کبابیے کے سپرد کیا کبابیے نے
کرایہ میں مجھے کیفے دل پسند کے مالک کے حوالے کیا جس کی دکان کے باہر
ایک کونے میں وہ کباب کی دکان لگاتا تھا کیفے دل پسند کے ہاں سے ماسٹر
ہرگانندا ٹیلر کی جیب میں آیا جس نے دوسرے دن مجھے سیٹھ منگھا رام کے حوالے
کیا جس نے ماسٹر ہرگانندا کی دکان سے ایک سوٹ سلوایا تھا۔ سیٹھ منگھا رام

لی کلب میں ایک بہت بڑی کیوریو شاپ تھی۔ وہاں بڑے بڑے امیر لوگ اور غیر ملکی سیّاح نوادر خریدنے آتے تھے۔ منگھا رام بڑی نادر چیزیں اپنی دکان میں جمع کر کے رکھتا تھا۔ ہانگ کانگ سے لے کر نیو یارک تک اس کے مال کی کھپت تھی۔ شہر کے باہر کئی علاقوں میں اس نے چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں قائم کر رکھی تھیں جہاں نہایت رازداری سے پرانا مال تیار ہوتا تھا۔ ایک فیکٹری میں ساتویں صدی کے بدھ کے بت بنائے جاتے تھے۔ ایک فیکٹری دو صدی قبل از مسیح کشیدہ بت بنانے کے لئے وقف تھی۔ ایک فیکٹری میں صرف وہ سامان تیار ہوتا تھا جو موہن جو دارو اور ہڑپا کی کھدائیوں سے نکلا۔ ایک فیکٹری صرف مغل عہد کے نوادر مینو فیکچر کرتی تھی۔ نورجہاں کا عطر دان۔ بابر کی تلوار۔ جہانگیر کا خنجر۔ جودھا بائی کی پوجا کی تھالی۔ اکبر کی انگوٹھی۔ اورنگ زیب کا اُگالدان اور ممتاز محل کا پان دان سب کچھ سیٹھ منگھا رام کے ہاں ملتا تھا۔ ایک فیکٹری پرانی لکڑی کے تاریخی سامان تیار کرتی تھی یعنی اشوک کی خوابگاہ کا دروازہ۔ چندر گپت کے پلنگ کا پایہ۔ مہارانی پدمنی کے آئینہ کا چوبی فریم۔ کالی داس کی جھونپڑی۔ گرو وشوامتر کی کھڑاویں۔ ایک دفعہ تو منگھا رام کا ایک سیلز مین ایک یورپی سیّاح کی چانکیہ رشی کی عینک تک بیچنے میں کامیاب ہو گیا تھا بارہ سو روپے میں۔ اور سیٹھ منگھا رام نے اپنے ملازم کی کارکردگی پر خوش ہو کر اُسے سو روپے انعام دیا تھا۔

کل رات سیٹھ نے دکان کے گلے میں سے کچھ رقم ادھار لی تھی۔

حساب پورا کرنے کے لئے اس نے اپنا بٹوا کھولا اور رقم برابر کر کے اس نے مجھے بھی نوٹوں میں ڈال کر کل رقم ایک ملازم کے حوالے کر کے کہا کہ وہ اسے کل کے حساب میں جمع کر کے بینک میں ڈال آئے۔

سیٹھ کے ملازم نے رقم لے کر احتیاط سے سب نوٹ گنے اور مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا ہیں کیونکہ متواتر استعمال سے اور پانچ سال گندی ہانڈی میں رہ کر اتنا کثیف، میلا اور خستہ ہو چکا تھا کہ ہر ایک کی نگاہوں میں چبھنے لگتا تھا۔

ملازم نے مجھے غور سے دیکھا یہ وہی ملازم تھا جو گرد چانکیا کی علنیک بیچ چکا تھا میں دیکھتے ہیں اب اس قدر پرانا ہو چکا تھا کہ اگر مجھ پر انگریزی حروف چھپے ہوئے نہ ہوتے تو وہی ملازم مجھے محمد تغلق کے زمانے کا نوٹ سمجھ کر بیچنے پر تیار ہو جاتا۔ اس پر بھی وہ مجھے دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھ میں ایسے کون سے سُرخاب کے پَر لگے ہیں جس کی وجہ سے وہ مجھے اس قدر غور سے دیکھ رہا ہے۔ دس کا نوٹ ہی تو ہوں آخر وہ ملازم سیٹھ کے پاس پہنچا مجھے سیٹھ کے سامنے میز پر رکھ کر بولا۔ ذرا یہ نوٹ غور سے دیکھئے۔"

سیٹھ نے مجھ پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر کہا۔ کیا دیکھوں؟ دس کا نوٹ ہی ہے۔ کیا تمہیں سو کا دکھائی دیتا ہے؟ سیٹھ نے ملازم پر ایک طنز آمیز نگاہ ڈال کے کہا۔

"ذرا غور سے دیکھئے! ملازم نے پھر اصرار کیا۔ "انڈیا کی ڈی آئی جے ..."

گئی ہے۔

سیٹھ نے چونک کر دیکھا۔ واقعی میرے ماتھے پر جہاں RESERVE

BANK OF INDIA لکھا تھا وہاں انڈیا کا لفظ یوں چھپا تھا… INOIA

"ارے واقعی D کی جگہ O ہے یعنی اُلٹی ڈی"

اور ملازم نے مجھے بالکل سیٹھ کی آنکھوں کے نیچے سرکاتے ہوئے کہا —

دیکھئے جہاں لکھا ہے

وہاں لفظ PROMISE کی E (ای) غائب ہے۔

"واقعی!" سیٹھ نے غور سے مجھے پرکھتے ہوئے کہا "واقعی! یہ تو…

یہ تو ایک نایاب نوٹ ہے" منگھارام کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا "اس کی

ڈی اُلٹی ہے اور ای بالکل غائب ہے۔"

یکایک سیٹھ کے دل میں ایک خیال گزرا اس نے ملازم کے منہ کی طرف

تکتے ہوئے کہا "کہیں جعلی تو نہیں ہے؟"

ملازم چپ رہا۔ سیٹھ کچھ سوچ کر بولا "تم یہ نوٹ یہیں چھوڑ جاؤ

میں سب معلوم کرتا ہوں۔"

میری جگہ اس نے ملازم کو دس کا دوسرا نوٹ دے کر بینک بھیج دیا اور خود

کرنسی آفس فون کر کے مجھے اپنی جیب میں ڈال کر چلا گیا میں پانچ چھ دن سیٹھ

منگھارام کے پاس رہا وہ روز مجھے بڑی احتیاط سے اپنی تجوری میں بند کر دیتا

تھا سب پوچھ تاچھ کرنے کے بعد جب سیٹھ نے اپنا اطمینان کر لیا تو یہ بات

سنتے ہی مندی کیا ایک نہ نوایا اور اس میں جنبش کر ملازم [illegible] تھا۔ میں نے

سب معلوم کر لیا ہے۔ یہ نوٹ بالکل اصلی ہے۔ ناسک سے شائع ہوا ہے مگر ڈائی غلط ہو گئی اور چھپ گیا۔ اس کے سیریل نمبر کے دوسرے تمام نوٹ غلط چھپنے کی وجہ سے تلف کر دیئے گئے مگر کسی کارکن کی غلطی سے یہ نوٹ کرنسی میں آ گیا۔ اپنی طرز کا واحد نوٹ ہے یہ ہندوستان بھر میں بالکل نایاب ہے میں اخباروں میں اس کا اشتہار دیتا ہوں اور اگلے ماہ کے نیلام میں اس کی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا اور اس کی جو کچھ قیمت حاصل ہو گی اس کا پانچ فی صد تمہیں دوں گا کیونکہ سب سے پہلے اس نوٹ کی نایاب خوبی تم نے پہچانی ہے"

ملازم نے جھک کر شکریہ ادا کیا اتنے میں سیٹھ کی نئی اسٹینو چند کاغذات ٹائپ کر کے حاضر ہوئی۔ سیٹھ منگھا رام پہلا خط پڑھتے ہی غصے سے بھڑک گیا ہجے کی اتنی غلطیاں Of course we promis to pay اس طرح لکھا جاتا ہے: promise کا "ای" غائب ہے ڈالر کا "ر" اسے "... کدھر گیا؟ کیا گھر سے ناشتہ کر کے نہیں آتی ہو؟ جو یہاں لفظوں کے حروف کھانے شروع کر دیتی ہو؟ ہماری فرم نیویارک تک بزنس کرتی ہے ایسی غلطیاں ہجے کی یہاں نہیں چلیں گی۔ اکاؤنٹنٹ سے اپنا حساب چکتا کرو اور جاؤ" سیٹھ نے کانپتی ہوئی نئی اسٹینو کے ہاتھ میں ٹائپ شدہ خط دستخط کئے بغیر واپس کرتے ہوئے کہا۔

اس دن نیلام میں بڑی بھیڑ تھی جس دن میری بولی لگائی گئی۔ دور دور سے نادر اشیاء خریدنے والے آئے تھے۔ اور بڑی حیرت کسی قدر شبہے

اور شوق سے مجھے دیکھنے آرہے تھے مگر سیٹھ منگھارام نے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی میں دمکتے ہوئے چاندی کے فریم میں سب کی نگاہوں کے سامنے موجود تھا چاندی کے فریم کے نیچے ناسک پریزی کا ایک سرکاری کاغذ ہوا میں ہوے ہوے ہل رہا تھا جس پر صاف الفاظ میں لکھا تھا کہ میں کوئی جعلی نوٹ نہیں ہوں اصلی نوٹ ہوں ،، میری تاریخ اشاعت بھی درج تھی شبے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

بولی شروع ہوئی۔ سیٹھ منگھارام نے چلا کر کہا "دس کے نوٹ کی قیمت ایک ہزار روپے "۔

"دو ہزار روپے"

"تین ہزار روپے"

"تین ہزار پانسو"

"تین ہزار سات سو"

"تین ہزار سات سو، تین ہزار سات سو"

"ساڑھے چار ہزار"

"پانچ ہزار"

میرا سر چکرانے لگا۔ کیسی عجیب و غریب دنیا ہے کل تک میں محض دس کا نوٹ تھا آج میری قیمت پانچ ہزار روپے ہے۔ مجھے وہ ہزاروں آنکھیں یاد آگئیں جنھوں نے اب تک مجھے دیکھا تھا۔ اور میرے ماتھے پر

لکھے ہوئے لفظوں پر بھروسہ کیا تھا ۔

"چھ ہزار روپے"

"سات ہزار روپے"

"سات ہزار آٹھ سو"

"سات ہزار آٹھ سو، سات ہزار آٹھ سو ۔ ۔ ۔ ایک

"آٹھ ہزار، نو ہزار، دس ہزار"

دس ہزار ؟ میں حیرت سے چونک پڑا کیا میری قیمت واقعی دس ہزار ہے ؟ کل تک میں دس روپے کا نوٹ تھا آج قیمت دس ہزار کیسے ہو گئی ؟ وہی میں ہوں، وہی کاغذ ہے وہی ٹھپّا ہے "بارہ ہزار" بارہ ہزار ۔ ۔ ۔ ؟ بارہ ہزار میں ایک لڑکی کی شادی ہو سکتی ہے" مگر بولی بڑھتی گئی

"تیرہ ہزار"

"تیرہ ہزار چھ سو"

"چودہ ہزار"

"اٹھارہ ہزار" ایک دُبلا پتلا نوجوان کانچ کے بڑے بڑے محدّب شیشوں والی عینک چڑھاتے ہوئے بولا ۔

"اٹھارہ ہزار ؟ ۔ ۔ ۔" میں نے زرد رُو تقریباً کرم خوردہ نوجوان کے بوسیدہ صحت والے جسم کی طرف دیکھا ۔ اب میری قیمت اٹھارہ ہزار ہے ۔

کل تک میں ونا سپتی کا ایک ڈبّا بھی نہیں خرید سکتا تھا اور آج ایک موٹر خرید سکتا ہوں ۔۔۔ اٹھارہ ہزار ۔۔۔ ؟

"اٹھارہ ہزار ۔۔۔ اٹھارہ ہزار ۔۔۔ سیٹھ منگھا رام اس زرد رو نوجوان کی طرف دیکھ کر چلّایا ۔ وہ اسے پہچانتا تھا ۔ وہ زرد رو نوجوان ملک کے مشہور کروڑپتی سیٹھ چمن لال کا بیٹا مگن لال تھا ۔ مگن لال کو نوادر جمع کرنے کا بے حد شوق تھا ۔ اس نے اپنے عالی شان گھر میں ایک عجائب خانہ بنا رکھا تھا جس میں وہ دنیا بھر کے کیوریو لا کے جمع کرتا تھا محدّبہ شیشوں کے پیچھے اس کی ہیجنی آنکھیں گہرے تجسّس شوق اور اضطراب سے چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ۔ وہ نوادر کا دیوانہ تھا ۔

اب سب لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے مگن لال کا مقابلہ ایک امریکی سیّاح سے تھا ۔ چارلس ڈوگلس نیویارک میں سالسٹر تھا ایک کامیاب وکیل ، دنیا کے امیر ترین ملک کا شہری ۔۔ وہ پیچھے نہیں ہٹے گا ۔

"بیس ہزار !"

"بائیس ہزار" مگن لال بولا

"پچیس ہزار"

ڈوگلس نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑی بے پرواہی سے کہا ۔

"ستائیس ہزار" مگن لال اپنی باریک آواز میں اتنی زور سے چلّایا ۔ کہ مجمع میں ہر ایک کے چہرے پر مسکراہٹ جھلک اٹھی ۔

"تیس ہزار ! ڈوگلس اپنی ٹھنڈی بھاری آواز میں بولا ۔

"تیس ہزار؟" میرے ہوش و حواس جواب دینے لگے۔ آخر میں نے کیا کیا تھا؟ کونسا تیر مارا تھا؟ کون سی ایسی کڑی محنت کی تھی؟ کس کی بھلائی کے لئے دن رات ایک کر دیا تھا؟ جس کے انعام میں میری قیمت اس قدر بڑھا دی گئی تھی؟ مگر یہ تو ایک عجیب و غریب نامعقول ٹیڑھا سماج ہے۔ یہاں ہر خوبی خامی ہے۔ یہاں اگر آپ سیدھے سچے اور کھرے ہیں تو آپ کی قیمت دس کے نوٹ سے زیادہ نہیں ہو سکتی لیکن اگر آپ کی ڈی ایسی ہے اور ای غائب ہے تو آپ کی قیمت تیس ہزار بھی ہو سکتی ہے نوٹ کے ہجے غلط ہوں تو وہ سب سے قیمتی ہے۔ آدمی کے ہجے غلط ہوں تو دفتر سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

"ستیس ہزار!" مگن لال غصّے سے چلّایا۔

چارلس ڈوشل مسکرایا۔ اس کا مقابلہ ایک دیو اتنے سے تھا یکایک اس نیلام سے اس کی ساری دلچسپی غائب ہو گئی اور وہ پلیٹ کرشو کا کوئی پرانا نابت دیکھنے لگا۔ چند منٹ تک سیٹھ منگھا رام اسے متوجہ کرنے کے لئے چلاتا رہا اور میری خوبیاں بڑھا چڑھا کے بیان کرتا رہا مگر اس امریکی سیاح کا دل مطلق نہ پسیجا۔ آخر اس نے مجھے ستیس ہزار روپے کے عوض مگن لال کے حوالے کر دیا۔

چمن لال کی کان پور میں لوہے کی ایک بہت بڑی فونڈری تھی اور اب وہ گوالیار میں ریان کا ایک بہت بڑا کارخانہ کھولنے میں مصروف تھا

اسے ایک ہی بات کا غم تھا۔ اس کے بیٹے کی کوئی اولاد نہیں تھی — مگن لال ابھی تک لاولد تھا اور مگن لال چمن لال کا اکلوتا بیٹا تھا۔

مگن لال اولاد پیدا کرنے کے لئے تقریباً ناقابل تھا۔ تقریباً اس لئے کہ اس کے جذبات تو مرد کے سے تھے وہ عشق کی آگ اور اس کی حدت ایک مرد کی طرح محسوس کرتا تھا مگر اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ وہ محسوس کرتا کہ تخلیق کا شعلہ سا اس کی روح میں لپک رہا ہے مگر اس کی روح اور اس کے شدید احساسات کے گرد جسم ایک ٹھنڈے پن اور برفیلے خول کی طرح — لپٹا ہوا ہے اور یہ برف جو کسی طرح پگھلتی نہیں ہے اس کے بھڑکتے ہوئے خوبصورت جذبات ناکام بنا دیتی اور وہ ایک زخم کھائے ہوئے جانور کی طرح روح کے شدید احساسات اور اپنے جسم کے پُرہول سناٹے کی آویزش سے چیخ اُٹھتا۔ ٹھنڈے جسم کے ساتھ اگر روح بھی ٹھنڈی ہو تو کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن فطرت نے اسے ایک شعلہ جیسی روح دے کر اور اس کے گرد برف کا ایک دائرہ کھینچ کر اس سے شدید بے انصافی کی تھی کیونکہ مگن لال کی حُسن پرستی انتہا کو پہنچ چکی تھی خوبصورت عورت دیکھ کر اس کا ذہنی ردّعمل وہی ہوتا تھا جو کسی مکمل مرد کا ہوتا ہے وہ اس کے خطرناک خم، اس کی نگاہ کی آتش نوائی اور اس کے ہونٹوں کی بولتی ہوئی دعوت سے اسی قدر متاثر ہوتا تھا۔ جس قدر بھی کوئی صحت مند اور تندرست مرد متاثر ہو سکتا ہے مگر اپنے افنان و خیزان جذبات کے سہارے ڈولتا ہوا جب وہ کسی عورت کے قریب چلا جاتا اور اسے چھونے کی کوشش

کرتا تو نہ صرف اس عورت کو بلکہ خود اسے بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ کسی مرد کی انگلیاں نہیں ہیں جو کسی عورت کو چھو رہی ہیں برف کی تلیں ہیں جن کے مس سے عورت کے بدن میں بیزاری اور نفرت کی لہریں دوڑ رہی ہیں اور وہ کانپ کر پیچھے ہٹ جاتا۔ دیواروں سے ٹکریں مارتا۔ دو دفعہ اس نے خودکشی کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ مگر ناکام رہا۔

پے در پے ناکامیوں کے بعد اب اس نے اپنی روح کی شعلہ سامانی تحلیل کرنے کا ایک راستہ ڈھونڈ لیا تھا اس نے اپنی شدید جنسی حس ایک شدید جمالیاتی حس میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی عورت کا جسم اس کا نہیں ہو سکتا تھا مگر خوبصورت تصویریں تو اس کی ہو سکتی تھیں اور سنگِ مرمر کے پرانے بت پرونیس کا شبہ ہوتا تھا۔ کانسی کے نٹ راج کا منجمد خرام اور وہ شمع دان جو مغلوں کے حرم میں حسن و عشق کو تیز کرتے تھے، ان اشیا اور کیوریوز پر وہ دائمی قبضہ کر سکتا تھا اور ان اشیاء کا حسن ایسا تھا جو اس کی ٹھنڈی انگلیوں کے مس سے بیزار نہیں ہو سکتا تھا وہ ایک کروڑپتی کا بیٹا تھا اور اس کی جائیداد کا واحد وارث تھا۔ اب اگر وہ خوبصورت عورت کا حرم نہیں سجا سکتا تھا تو خوبصورت چیزوں کا ایک عجائب خانہ کھول سکتا تھا اور یہی اس نے کیا اس نے اپنے محل نما گھر کا ایک وسیع حصہ وہ حسین و جمیل نوادر رکھنے کے لئے وقف کر دیا جو وہ دنیا کے مختلف حصوں سے خرید کر جمع کرتا تھا ہوتے ہوتے اس کا یہ شوق بڑھتا گیا اور اب وہ یہ نوادر خریدنے کے لئے اور سنبھالنے اور دوسروں کو دکھانے میں ایک لذتِ معکوس سی محسوس کرتا تھا۔ اس

کی بیکراں روح کا کرب اپنی جگہ موجود تھا مگر اب گاہے گاہے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے کسی نے اس کے زخم پر پھایا رکھ دیا ہو۔

مگر اس کا باپ ایک عملی آدمی تھا اتنا اس کے لئے کافی نہیں تھا۔ یہ کہ اس کے بیٹے کے مرنے کے بعد اس کی کروڑوں کی جائیداد دوسرے لوگوں میں بٹ جائے گی اس کا خیال ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا اس نے اپنے بیٹے کو ٹھیک کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کئے۔ طرح طرح کے علاج کئے۔ چار بار اسے یورپ لے گیا جدید سے جدید طریقے آزماتے ہوئے اس نے لاکھوں پھونک ڈالے۔ ان میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مگن لال کی شادی کسی حسین لڑکی سے کر دی جائے مگر مگن لال کے بار بار منع کرنے پر چمن لال نے اپنے بیٹے کی شادی ایک غریب گھرانے کی مگر انتہائی خوبصورت لڑکی سے کر دی۔

رسنا اس کا نام تھا۔ شباب کا رس اس کی رگوں میں دوڑتا نہیں تھا۔ کھولتا تھا وہ تند و تیز لاوے کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی اس کے جسم میں بپھرے ہوئے سمندر کی لہروں کا خرام تھا اس کی نگاہوں میں بجلی کا کوندا تھا اور انگلیوں میں آگ کی لپٹ مگن لال اسے دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔ یکایک اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ رسنا کو اپنی باہوں میں لے کر مکمل مرد بن جائے گا۔

پھر وہ بجھ سا گیا۔ رسنا چند ماہ تو اپنے کھولتے ہوئے جذبات میں کسماتی رہی، ٹوٹتی رہی اور ٹوٹ ٹوٹ کر بنتی رہی پھر وہ یکایک پاگل ہو گئی۔ دو سال تک پاگل رہی۔ پھر جب اچھی ہوئی تو وہ بھی بجھ سی گئی اس کے سسر نے اس محل نما گھر میں اپنی بہو کے لئے ایک مندر بنوا دیا تھا جہاں وہ اکثر اکیلے میں پوجا کرتی اور اپنا دل بہلایا کرتی تھی اس کی آواز میں ایک عجیب کرب آمیز سنگیت کا رس اتر آیا تھا۔ گھنٹوں وہ رادھا کرشن کی مورتیوں کے سامنے بیٹھی اپنے چھوٹے سے مندر میں بھجن گایا کرتی اور بھجن گاتے گاتے ایک عجیب محویت کے عالم میں بے ہوش ہو جایا کرتی وہ ایک غریب گھر کی لڑکی تھی مگر اسے یہاں زندگی کی ہر آسائش میسر تھی دو گورنسیں اسے بہترین تعلیم اور مغربی آداب سکھانے پر مامور کی گئی تھیں نوکروں کا ایک لمبا چوڑا عملہ تھا جو دن رات اس کی ہر خواہش چٹکیوں میں پوری کرنے کے لئے کوشاں رہتا تھا اس پر بھی کئی بار رسنا کا دل یہاں سے بھاگ جانے کو چاہا۔ مگر سونے کی زنجیریں بہت خوبصورت تھیں۔

رسنا کو شدید طور پر چاہنے کے باوجود اب مگن لال نے اس سے الگ رہنا سیکھ لیا تھا۔ کیونکہ ساتھ رہنے میں شدید کوفت ہوتی تھی ایسا لگتا جیسے جسم و جان کا رشتہ ریشہ ریشہ ٹوٹ جائے گا وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ اپنے کیوریوز کے ساتھ صرف کرتا تھا۔ ان اشیاء کے ساتھ اس کا ملنا جلنا اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اکثر اوقات اکیلے میں وہ ان سے گفتگو تک کرنے لگتا اور اسے محسوس ہوتا کہ تصویریں بھی بولتی ہیں

اور سنگِ مرمر کے یونانی صنم اس سے باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ اب وہ محل کے اُس حصّے میں بہت کم جاتا تھا جہاں رسنا رہتی تھی صرف دوپہر کے کھانے پر وہ ملتی تھی اور رات کے کھانے پر اور یہ دونوں اوقات بھی اس کے لئے سوہانِ روح بن جاتے مگر وہ مجبور تھا۔ پتاجی کا حکم تھا اور پھر نوکروں کے سامنے دنیا داری بھی برتنا ضروری ہے۔

جس دن مگن لال نے مجھے خریدا۔ وہ اپنی غیر متوقع کامیابی پر اس قدر خوش ہوا کہ یہ خوش خبری رسنا کو سنائے بغیر نہ رہ سکا وہ مجھے ایک نوزائیدہ بچے کی طرح اپنے ہاتھوں میں تھامے رسنا کے بیڈ روم میں چلا گیا جو اب دوپہر کی نیند سے کر سنگھار میز کے سامنے اپنے کھلے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ بل کھاتے ہوئے آراستہ بال جو کمر تک جاتے تھے کنگھی اور رسنا کے بالوں کے ملے جلے لمس سے لہراتی ہوئی ناگنوں کی طرح بیدار ہو رہے تھے۔ رسنا اسے یوں غیر متوقع طور پر اپنے بیڈ روم میں آتے دیکھ کر چونک پڑی۔ مگن لال بے حد خوش ہو کر اس کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ دیکھو! میں نے کیا خریدا ہے؟ وہ بچوں کی طرح چلّا اٹھا۔

رسنا نے مجھے دیکھ کر کہا "یہ تو دس روپے کا نوٹ ہے" ہاں ہے تو دس روپے کا۔ مگر میں نے اسے تیس ہزار روپے میں خریدا ہے"

"ایسے باولے پن کی باتیں تم اکثر کرتے رہتے ہو۔"

"یہ باولا پن نہیں ہے یہ کوئی معمولی عام دس روپے کا بازاری نوٹ نہیں ہے۔ یہ ایک خاص نوٹ ہے، نایاب نوٹ ہے اس نوٹ کا ثانی

سارے ہندوستان میں نہیں ہے بلکہ شاید ساری دنیا میں نہیں ہے
آج دوپہر میں نے نیو یارک میں ایک ڈیلر کو ٹیلیفون کیا تھا وہ اس نوٹ
کے عوض ایک لاکھ ڈالر دینے کو تیار ہے۔
"آخر اس نوٹ میں ہے کیا؟" رسنا بڑی بیزاری سے میرا چاندی
کا فریم دیکھنے لگی اور کانچ پر ہاتھ پھیر کر اور مجھ پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال
کر سر اوپر اٹھا کے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ استفہامیہ نگاہ سے
" ذرا غور سے دیکھو انڈیا کی ڈی الٹی چھپ گئی ہے اور اس کی ای
غائب ہے۔" مکھن لال نے اسے بتایا۔
اب رسنا نے غور سے مجھے دیکھا پھر خاموشی سے اپنے شوہر کی
طرف دیکھا۔ اگر نوٹ کی ڈی الٹی ہے اور ای غائب ہے تو کیا ہوا؟
اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ "تمہارے جسم کی ای بھی تو غائب ہے اور
ڈی الٹی ہے۔ پھر میں کیا کروں؟"
" اس دس روپے کے نوٹ کے جسے میں نے تیس ہزار میں خریدا ہے
آج ایک لاکھ ڈالر مل رہے ہیں یہ دنیا کا سب سے قیمتی نوٹ ہے۔ آج
تمہاری سالگرہ ہے۔ اس موقع پر یہ نوٹ تمہیں تحفے میں دیتا ہوں۔
رسنا نے مجھے دیکھا۔ سنگھار میز کے لمبے آئینے میں اپنے بال اپنی کمر
کے نازک خم تک لہراتے دیکھے کمرے کے وسط میں خوب صورت ریشمی
چادروں سے سجے ڈبل بیڈ کی طرف دیکھا پھر وہی جلن اور کسولن کی ایک
لہر تڑپتی ہوئی اس کے گلابی گالوں تک آئی اور الاؤ اس کی آنکھوں میں

چمکنے لگا اور اس نے مجھے زور سے اٹھا کے فرش پر پٹخ دیا۔ چاندی کا فریم تو نہیں ٹوٹا لیکن کانچ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے

وہ شعلہ بار نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی نگاہوں کی نفرت کی کاٹ مگن لال کے دل تک اتر گئی۔ ایک لمحے کے لیئے وہ ضرور بھونچکا رہ گیا تھا پھر اس نے آہستہ سے سر جھکا لیا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے چاندی کا فریم اٹھایا جس میں وہ جڑا ہوا تھا اور مجھے لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

رسنا تے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ناخنوں سے نوچ نوچ کر اس نے اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے اور ماہئی بے آب کی طرح فرش پر لوٹنے لگی اس کا سارا بدن جل رہا تھا اور ہلکی ہلکی چیخیں اس کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں۔ یہ چیخیں جو اس کے ان چھوتے بدن کی کراہیں تھیں۔

پھر اس نے سنگھار میز سے یوڈی کلون کی ایک بوتل اٹھائی جس کے منہ پر ریشمی ڈوریوں میں بندھا ربر کا فوارہ لگا ہوا تھا ربر دبا دبا کر وہ یوڈی کلون کی پھوار اپنے منہ پر اپنی گردن پر اپنی چھاتیوں پر اپنے جسم کے مختلف حصوں پر ڈالنے لگی۔ جہاں یوڈی کلون کی پھوار پڑتی تھی جسم ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔

انہیں دنوں ایک انگریز ڈاکٹر ولیم رشر شہر میں وارد ہوا وہ تنفسیاتی طریقہ سے علاج کرتا تھا پورے یورپ میں اس کے نئے طریقۂ علاج کی دھوم تھی

وہ یہاں تین ماہ کے لیے آیا تھا۔ چمن لال نے اپنے بیٹے اور بہو کو اسے دکھایا ولیم رشر کے پاس ڈاکٹری کی کوئی رسمی ڈگری نہیں تھی۔ اس کے علاج کا طریقہ بھی انوکھا تھا، اور عجیب و غریب تھا مگر اس نے کئی پرانے مریض حیرت انگیز طریقہ سے ٹھیک کر دیے تھے۔ وہ صرف بڑے بڑے لکھ پتی گھرانوں کا علاج کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی پہلی فیس ہی پچاس ہزار روپے تھی۔ ظاہر ہے، اتنی بڑی فیس تو کوئی ہماشما ادا نہیں کر سکتا ہے۔

مگن لال اور سنا کے طبی معائنے کے بعد سیٹھ چمن لال اور ولیم رشر میں دیر تک باتیں ہوئیں۔ کیا باتیں ہوئیں؟ یہ کوئی نہیں جانتا مگر بات چیت کے بعد ولیم رشر پھر مگن لال سے ملنے کے لیے اس کے عجائب گھر میں گیا مگن لال سے اس نے اس کا عجائب گھر دیکھنے کی فرمائش کی۔ دیر تک مگن لال اُسے اپنے عجائب گھر کے نوادر دکھاتا رہا۔ کویت کی کھدائیوں سے دستیاب کیے گئے نامعلوم بت گردں کے حسین مجسمے، زہرہ کے مجسمے ایفرو ڈایتی کے مجسمے، اہرام مصر سے چرائے ہوئے فراعین کے زمانے کی ممیاں اور ان کے زیورات۔ مصری کاہنوں کے گلے کے مقدس ہار۔ بھارت ناٹم ناچتی ہوئی رقاصہ کا بت کانسی کا اور گیارھویں صدی کی قدیم سسلی کے بنے ہوئے خنجر اور چاندی کے فریم میں جڑا ہوا چاندی کا ایک نوٹ جس کی قیمت آج ایک لاکھ ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔

مگن لال کو خیال تھا کہ ڈاکٹر کو ان نوادر کے سلسلے میں زیادہ واقفیت نہ ہوگی مگر لمبے تڑنگے، مضبوط اور بے داغ جلد والے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر رشر کی

معلومات بے حد وسیع اور جامع ثابت ہوئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے آثارِ قدیمہ کے بارے میں وہ خود کئی سال تک ریسرچ کرتا رہا ہو۔ مگن لال کو اس کی معلومات پر بڑی حیرت ہوئی، ڈیڑھ دو گھنٹے عجائب گھر میں گھومنے کے بعد مگن لال تھک گیا۔ وہ جلدی تھک جاتا تھا۔ دوسرے موقعوں پر وہ اس کام کے لئے دو پہیوں والی ایک کرسی کا استعمال کرتا۔ مگر آج اس مغربی ڈاکٹر کے سامنے اس نے خود دھیل کرسی پر بیٹھ کر اسے عجائب گھر دکھانا مناسب نہیں سمجھا۔

عجائب گھر دیکھ کر وہ دونوں مغربی کونے کے ایک آرام دہ کیبن میں آگئے جو مضبوط کانچ کا بنا ہوا تھا جس کی ایک دیوار میں ٹنگا ہوا تھا۔ یہ کیبن مگن لال کا ایک طرح کا دفتر تھا اس کے سوچ بچار کا کمرہ تھا۔ یہیں وہ دوپہر میں ایک کونے میں پڑے ہوئے دیوان پر لیٹ کر آرام کر لیتا تھا اس کیبن میں پہنچ کر مگن لال نے ایک سگریٹ سلگایا ڈاکٹر نے اپنا سگار سلگایا اور چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہو گئی پھر ڈاکٹر بولا میرا خیال ہے تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے"

"ایں ۔۔" مگن لال حیرت سے چونک کر تقریباً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو، بیٹھو ۔۔۔!" ولیم رشر کی نیلی اُجلی صاف آنکھوں میں ہمدردی کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔

"مگر ۔۔۔؟" اتنا کہہ کر مگن لال حیرت سے ولیم رشر کی طرف دیکھنے لگا۔ کیسی وجیہہ کڑی گردن ہے ڈاکٹر کی کس قدر پر اعتماد چہرہ ہے ڈاکٹر کا

کیا یہ ڈاکٹر جھوٹ بول رہا ہے ؟ آج تک دنیا میں کسی ڈاکٹر نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اُسے کوئی عارضہ نہیں ہے۔ ہر ڈاکٹر بس اسی کو ذمے دار ٹھہراتا تھا۔ یہ پہلا ڈاکٹر تھا۔۔۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگن لال حیرت سے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف تکے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر رشر نے مسکرا کے کہا۔ اس کی مسکراہٹ بھی کس قدر صحت مند اور دلآویز ہے جیسے خوشی اندر سے جھانک رہی ہو عمر بھی پینتیس چھتیس سے زیادہ نہیں ہو گی مگن لال نے اُسے دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا، سنو مگن! میرا خیال ہے تمہارے جسم میں کوئی نقص نہیں نہیں ہے۔ نقص رسنا کے جسم میں ہے"۔

"رسنا میں ؟" مگن لال کی آواز یک لخت اونچی ہو گئی۔

ہاں، ہاں! رسنا میں، چلاؤ نہیں اطمینان سے میری بات سنو، میں ٹیکنیکل تفصیلات میں نہیں جا سکتا۔ تم سمجھ نہیں سکو گے۔ موٹے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تمہارا اعصابی نظام بے حد ذکی الحس ہے تمہیں ایسی عورت کی ضرورت نہیں ہے جو لاوے کی طرح بھڑکتی ہو۔ ایسی عورت کا جسمانی ٹمپریچر تمہارا اعصابی نظام شل کر دے گا۔ بدقسمتی سے اس عمر میں جس میں رسنا ہے نوجوان عورتوں کا جسمانی ٹمپریچر بالعموم یہی ہوتا ہے پھر جلد کے اندرونی خلیوں میں جسم کے ہر حصے سے مرد اور عورت کے درمیان الیکٹریکل چارج گزرتے ہیں وہ مرد اور عورت کے درمیان ایک مخصوص قسم کا جنسی توازن بناتے ہیں۔ اگر وہ الیکٹریکل چارج ایک طرف سے بہت نیچا ہے اور دوسری طرف سے بہت اونچا ہے تو توازن قائم

نہیں ہوگا۔ تمہارا حساس اعصابی نظام دوسری طرف سے آنے والا الیکٹریکل چارج برداشت نہیں کرتا اور مثبت، منفیت میں تبدیل ہو جاتی ہے یا نیوٹرل چارج میں بدل جاتی ہے۔"

"مگر وہ دوسری عورتیں ۔ ۔ ۔ ؟" مگن لال نے جملہ ناتمام رہنے دیا

"بدقسمتی سے تمہیں جو بھی عورتیں ملیں، وہ ہائی وولٹیج والی تھیں۔ ورنہ تمہارے جسم میں کوئی نقص نہیں ہے وہ ایک ذہین اور حساس اعصابی نظام کا مکمل نمونہ ہے میں تمہارے اعصابی نظام میں کوئی تبدیلی لانا پسند نہیں کروں گا۔ مگر رسنا کا علاج کرنا چاہوں گا۔ اس کا جسمانی ٹمپریچر بدلنا چاہوں گا۔ اس کی نفسیات کا مطالعہ کر کے اندرونی خلیوں کو بائیوکیمک بجلی کی زد و میں کرنا چاہوں گا۔ مگر یہ سب کچھ تمہاری اجازت تمہاری تحریری اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے"

مگن لال کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ بڑی مشکل سے بولا۔ ڈاکٹر کیا تمہیں واقعی یقین ہے کہ مجھ میں کوئی نقص نہیں ہے ؟

"سو فی صدی"

"اور رسنا تمہارے علاج سے اچھی ہو جائے گی ۔ ؟"

"اس کی بھی مجھے سو فی صدی امید ہے ۔ رسنا ضرور میرے علاج سے اچھی ہو جائے گی ۔ اس میں وقت بھی لگے گا اور مصارف بھی خاصے آئیں گے مگر آخر اس بات کی قوی امید ہے کہ میں رسنا کے جسم کا الیکٹریکل توازن ٹھیک کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا ۔

"مگن لال نے پُر جوش طریقے سے ڈاکٹر ولیم رشر سے ہاتھ ملایا اور کانپتی ہوئی پُر اُمید آواز میں بولا۔ ڈاکٹر تم علاج شروع کر سکتے ہو۔"

ولیم رشر رسنا کو کئی بار سینما لے گیا اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ رسنا رومانٹک تصویریں بالکل پسند نہیں کرتی تھی وہ زیادہ تر ہارر پکچر دیکھنا پسند کرتی تھی ایسی تصویریں جن میں مجنونانہ مار دھاڑ ہو یا پُر اسرار پُر ہیبت ماحول ہو یا خوفناک جسمانی اذیت کے پُر ہول نظارے ہوں۔ ایسی تصویروں سے اسے ایک عجیب قسم کا ذہنی سکون ملتا تھا۔

ولیم رشر اسے کئی بار سمندر کے کنارے ٹہلانے لے گیا۔ اور پھر اس کا اندازہ صحیح نکلا۔ رسنا کو خاموش بہتا ہوا سمندر پسند نہیں تھا بپھرے ہوئے سمندر کی طوفانی لہریں اسے بے حد پسند آئیں "جی چاہتا ہے دوڑ کر ان میں کود جاؤں"، رسنا ڈاکٹر کو دیکھ کر بولی۔

وہ اس وقت سمندر کے کنارے ایک سنسان ساحل پر کھڑے تھے دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ "تو کود جاؤ!" ڈاکٹر نے کہا۔

"مجھے تیرنا نہیں آتا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ کمر تک پانی میں نہاؤ۔ دور تک آگے مت جاؤ۔"

"میں ڈوب جاؤں گی" رسنا کانپ کر بولی۔

"میں تمہیں بچا لوں گا۔ مجھے تیرنا آتا ہے" ولیم رشر بولا۔ "سارے کپڑے اُتار دو اور پانی میں گھس جاؤ۔"

"ہائے! اوہ یک دم خوشی اور ڈر سے بول پڑی "میرے پاس تو کوئی

بھی نہیں ہے۔"

"کوئی پروا نہ کرو! میں منہ پھیر لیتا ہوں۔ تم کپڑے اتار کر مجھے سمندر میں گھس کر آواز دینا۔"

"نہیں!" رستا شرماتے ہوئے بولی۔ اس کے گال سرخ ہو گئے اور تیز ہوا سے اس کے بال بکھر بکھر کے اس کے ماتھے پر آ رہے تھے

ولیم رشر نے اس کے کانپتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی مگر مضبوطی سے کہا "جیسا میں کہوں، ویسا کرو!"

"تو تم اپنا منہ ادھر کر لو!"

"لو کر لیا۔"

دھیرے دھیرے جھجکتے ہوئے رستا نے سارے کپڑے اتار دیئے صرف ایک چڈی اور چولی پہنے ہوئے پانی میں گھس گئی اور لہروں سے کھیلنے لگی۔ یکایک ہنسی کا فوارہ سا اس کے منہ سے ابل پڑا وہ چیخ کر بچوں کی طرح چنچل آواز میں بولی "تم بھی آ جاؤ۔ پانی بہت مزیدار ہے۔"

پانی رستا کے سارے جسم میں گدگدی کر رہا تھا جھاگ کے سفید سفید بلبلے اس کا سارا جسم چوم رہے تھے چاروں طرف پانی ہی پانی کی بانہیں وہ اور بھی سمندر کے اندر پانی میں گھس گئی۔

"آ جاؤ سمندر بہت مزیدار ہے۔"

"آگے مت جاؤ!" رشر نے اسے تنبیہہ کی۔

"میں نہیں ڈوبوں گی" رستا بچوں کی طرح منہ بناتے ہوئے بولی۔

وہ دو قدم اور پانی کے اندر گئی۔ سمندر کی ایک بہت بڑی اچھال یکایک اس کے بدن سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ پانی بہتے ہوئے جذبوں کی طرح اس کے بدن سے گزر رہا تھا۔ جھاگ کی سیمیں کرنیں آوارہ قہقہوں کی طرح اس کے جسم پر رقصاں تھیں رسنا خوشی سے بے اختیار ہنسنے لگی۔ لہریں اور دور تک انگڑائیوں کی طرح ٹوٹنے لگی تھیں۔

کھلا نیلا آسمان رشر کی آنکھوں کی طرح صاف اور بے داغ، دُور دُور کہیں کہیں اونچے لانبے ناریل کے درخت رشر کے جوان اور مضبوط جسم کی طرح تنومند اور اکیلے سمندر کا پُر شور آرکسٹرا اور لہروں کی جوان باہیں رسنا نے دو قدم اور آگے کر لئے اب پانی اس کے کندھوں تک تھا۔

"اب آگے مت جاؤ" رشر مسکرا کر بولا۔ رسنا اُسے کپڑے اتارتے ہوئے دیکھ رہی تھی رشر نے قمیص اتار دی اس کے سینے کے بھورے بال ہوا میں ہولے ہولے ہلنے لگے جیسے اوپر پیڑ کی چوٹی پر ہوا میں ہلتی ہوئی ناریل کی سبز سبز مورپنکھیاں "اپنی آنکھیں بند کر لو" رشر رک کر بولا۔ رسنا زور سے ہنسی اس نے اپنی آنکھیں بند کریں۔ یکایک سمندر کی دوسری اچھال آئی اور رسنا کے سر سے گزر گئی جب گزر گئی تو رسنا کا کہیں وجود نہیں تھا۔ صرف گرداب کے تھپیڑے سے تھے اور کف آلود سمندر، چند لمحوں بعد رسنا کا جسم رشر کو قریب کے پانیوں میں ہاتھ مارتا نظر آیا وہ اچھل کر پانی میں کود گیا۔

"میں ڈوب رہی ہوں" رسنا یک بارگی زور سے چلائی پھر ڈوب گئی۔ پھر دوبارہ جب اُبھری تو رشر کی باہوں نے اُسے اوپر اچھال لیا وہ پانی میں بہت گہری تھی

چند لمحوں میں رشر نے معاملہ سنبھال لیا تھا۔ وہ اب اسے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے ساحل کی طرف لا رہا تھا۔

رسنا پانی کی گُلّیاں کرتی تھی ڈر سے اس کے سینے سے لپٹی جا رہی تھی خوف سے ہانپتی تھی۔ بچ جانے کی خوشی تھی رشر کی باہیں بہت آرام دہ تھیں اس لئے اسے کچھ بُرا سا بھی لگا جب صاف خشک ریت پر آ کے رشر نے اسے الگ لٹا دیا۔

" اٹ واز . . . اٹ واز . . . ٹچ . . . اینڈ گو" وہ ہانپتے ہوئے انگریزی میں بولی۔

" شیور " رشر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا " تم میرے اس قدر قریب تھیں تبھی تو میں نے تمہیں پانی میں جانے کی اجازت دی تھی۔

رسنا کی گول گول کُہنیاں ریت میں گیلے گڑھے بنا رہی تھیں وہ اپنے بازو سکیڑ کر ان گڑھوں میں اپنی انگلی پھیرتی ہوئی بولی " اگر میں ڈوب جاتی تو تم کیا کرتے ؟

" میں سمندر کو آواز دیتا اور لہروں کی اُچھال میں تمہارا جسم ڈولفن کی طرح برآمد ہوتا۔ "

" ڈاکٹر رشر! رسنا بولی۔

" مجھے وِل کہو "

" ول ؟ "

" ہوں ! "

"جانتے ہو تم نے آج میری جان بچائی ہے؟"

مگر دل کچھ دیر تک نہیں بولا۔ اُس نے اپنے ہاتھ چوڑے سینے پر باندھ لئے تھے اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شاید وہ سو رہا تھا۔ پھر رسنا نہیں بولی۔ صرف سمندر دیر تک گرجتا رہا اور کبھی کبھی کوئی لہر کانوں میں سرگوشی کر جاتی تھی۔ کوئی پون گھنٹے بعد جب دھوپ کے تولیئے نے ان کے گیلے جسم خشک کر دیئے تو رسنا ایک دم چونکی ڈاکٹر کو اپنے ہاتھ سے جھنجھوڑ کر بولی۔

"اٹھو گھر نہیں چلو گے کیا؟"

کپڑے پہن کر وہ دونوں واپس گاڑی کی طرف چلے۔ یکایک گاڑی میں بیٹھ کر رسنا نے اپنے دائیں کان کی لو کو ہاتھ لگا کے کہا "میرے کان کا ایک آویزہ شاید پانی میں ڈوب گیا۔"

"قیمتی تھا؟"

"ہیروں کا تھا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں کوئی مچھلی اسے نگل لے گی۔ کوئی ماہی گیر جال ڈال کر اُسے پکڑ لے گا۔ کسی دکان سے کوئی غریب عورت وہ مچھلی خریدے گی اور جب اس کا پیٹ چاک کرے گی تو وہ دمکتا ہُوا ہیرے کا بُندہ ایک معجزے کی طرح برآمد ہو گا۔

رسنا زور سے ہنسی "دل تم بھی کتنی دلچسپ بات کرتے ہو۔ ایسی باتیں تو میرے شوہر نے آج تک کبھی مجھ سے نہیں کیں"

دل بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "شوہر ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔"

اس نے بٹن دبا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

جب گاڑی اسٹارٹ ہو کر چلنے لگی تو دور چٹانوں کی اوٹ میں چھپا ہوا مگن لال دیر تک گردن گھما کر سڑک کے نیم دائرے میں گھومتی ہوئی گاڑی دیکھتا رہا پھر جب گاڑی موڑ سے غائب ہو گئی تو اس نے اپنی آنکھیں سمندر کے پانیوں پر جما دیں جس میں اس کی ہنسی کی ڈور پڑی تھی۔ دیر تک وہ ہنسی کی ڈور ہلائے بغیر سمندر کے پانیوں کو دیکھتا رہا۔

بہت رات گئے تک مگن لال اپنے عجائب گھر میں گھومتا رہا۔ آج اس نے شدید مصروفیت کا بہانا کر لیا تھا اور رات کے کھانے پر بھی نہیں آیا تھا۔ اپنا کھانا اس نے عجائب گھر میں منگوا لیا تھا۔ کھانا کھا کے اور فرنچ کونیاک کے دو چھوٹے چھوٹے جام پی کر وہ شیشی کا مجسمہ اس کے بکسے میں سے کھولنے لگا۔ یہ بکسا آج ہی بذریعہ ہوائی جہاز آیا تھا جس میں شیشی کا مشہور مجسمہ بند تھا۔ اس مجسمے کا نام تھا انگڑائی۔ ایک عورت انگڑائی توڑ رہی تھی۔ مگن لال بڑی بے قراری سے مجسمہ بکسے سے نکالنے لگا۔

بہت رات گئے کھانا کھانے کے بعد رسنا اور ولیم دیر تک باتیں کرتے رہے پہلے کھانے کے کمرے میں پھر ڈرائنگ کے کمرے میں جو رسنا کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ دل کے ہاتھوں رسنا نے پہلی مرتبہ تھوڑی سی بورڈو پی لی تھی۔ وہ پیتی نہیں تھی مگر دل نے اصرار کیا یہ بھی علاج میں شامل ہے شوپاں کی دھیمی دھیمی موسیقی ریکارڈ پر چل رہی تھی۔ رسنا کی آنکھوں میں کیف و سرور چھلکنے لگا۔ نیم غنودگی کے نشے میں بولی۔ "مجھے نیند آ رہی ہے"۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ! میں ابھی آتا ہوں۔"

رسنا نے چونک کر کہا۔ "تم کیوں آتے ہو؟"

"تمہارے جسم پر مالش کروں گا۔" رسنا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

فیسنی کا سیاہ عورت کا بُت قیامت خیز انگڑائی کے پوز میں تھا۔ مگن نے اسے ایک کونے میں کھڑا کر کے اسے چاروں طرف سے دیکھا بالکل بے عیب بے نقص، حد درجہ ہیجان انگیز وہ ایک نرم پُردار کپڑا لے کر اس سیاہ بُت کے اعضا چمکانے لگا۔ مگن نے اپنے ریکارڈ پلیئر ایک اُداس رومانی دھن کا ریکارڈ لگا دیا تھا پتھر کے بُت کے سڈول اعضا پُردار کپڑے پر لگے ہوئے پالش سے ہولے ہولے مچلنے لگے۔ مگن لال نے پُردار کپڑا نیچے رکھ دیا اور اپنے ہاتھ اس بُت پر پھیرنے لگا۔ اس کا اور میرا ٹمپریچر کتنا ملتا ہے، یہ پتھر کی ہے، میں برف کا ہوں۔ بجلی نہ اس میں نہ مجھ میں۔

ڈاکٹر رشر نے رسنا کے بیڈ روم میں دو ائر کنڈیشنز لگوائے تھے اس وقت اس نے ان کا ٹمپریچر درست کیا تھا۔ بتیاں بہت دھیمی کر دی تھیں اور اب وہ انتہائی سنجیدگی سے اپنی قمیص کی آستین اوپر چڑھائے ہوئے رسنا کی پیٹھ پر بادامی رنگ کے ایک مرہم سے مالش کر رہا تھا۔ اس کے سدھے ہوئے مشاق ہاتھ پاؤں کی پوروں سے کمر تک کے خم تک جاتے تھے۔ اور مالش کے دائرے پھیلاتے ہوئے لوٹ آتے تھے۔ رشر نے رسنا کو بتایا تھا کہ اس مالش کا اثر جلد کے اندرونی خلیوں تک پہنچ کر دھیرے دھیرے رسنا کا اعصابی نظام درست کر دے گا۔

ڈاکٹر رشر کمر سے کندھے تک پہنچا۔ اب وہ ڈبل بیڈ کے کنارے کھڑا ہو کر رسنا پر جھک کر اس کے کندھوں اور گردن پر مالش کر رہا تھا مگر رسنا کا اعصابی نظام ٹھنڈا ہونے کے بجائے اس کے جسم کے رگ و پے میں چنگاریاں بھر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ سلگنے لگی۔ پاؤں کی پوروں سے لے کر گردن کے خم تک وہ اپنے بدن میں بجلی کی ایک تیز رَو دوڑتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ پھر بھی وہ دانت پیس کر دم سادھے پڑی رہی ہے "بھگوان یہ بہت مشکل ہے... بہت مشکل ہے ... اُس نے جلدی سے اپنی بالوں کی ایک لٹ اپنے منہ میں دبالی اس کے نتھنے پھولنے لگے تھے اور سانس زور زور سے چلنے لگی تھی رسنا نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا تھا کل وہ یہ مالش نہیں کرائے گی، صاف انکار کر دے گی۔

ہولے سے ڈاکٹر رشر نے اس کے بالوں کی لٹ اس کے منہ سے نکال لی اب اس کے مرہم سے چکنے ہاتھ اس کے بالوں میں تھے ۔ ۔ ۔

"ناں ناں . . . میرے بال مت چھوؤ " رسنا نے اپنے دل میں کہا مگر کچھ بول نہ سکی۔ اس کا دم رُکنے لگا رشر کے ہاتھ بالوں میں آہستہ آہستہ گھوم رہے تھے۔ آہستہ آہستہ گردن اور گدّی میں چٹکیاں لیتے ہوئے بالوں کے اندر کی جلد سہلاتے ہوئے بالوں کی ایک ایک لٹ سنوارتے ہوئے رشر کو ایسا لگا جیسے وہ شعلوں میں کنگھی کر رہا ہے۔

یکایک کروٹ بدل کر رسنا اٹھی اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں اور ہونٹ غذا سے کھلے تھے اس نے غیظ و غضب کی ایک تیز نگاہ رشر پر ڈالی اور

اور اپنے دونوں بازوؤں سے اس کی گردن جکڑ کر دیوانہ وار اس کا منہ چومنے لگی

"..... دِل ... میرے دِل ... میرے ... میرے ... میرے دِل"

عجائب گھر میں مگن دونوں ہاتھوں سے اس سیاہ مُبت کے پاؤں پکڑے ہوئے

رو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے کونے میں ریکارڈ چل رہا تھا۔

آج سجن مورے انگ لگے ہیں

سپھل بھیو مم دھیا!

دن گزرتے گئے مگن زیادہ سے زیادہ اپنے عجائب گھر میں محصور ہوتا گیا۔ محل نما گھر کا زنانہ حصہ رسنا کے کھلے مسرت آمیز قہقہوں سے معمور ہوتا گیا اس کی چال میں زیادہ لچک آگئی تھی اور آنکھوں میں شراروں کی چمک کی جگہ ایک اُجلی نتھری دھوپ نے لے لی تھی ایسی دھوپ جو ساون کی گھٹا برس جانے کے بعد آتی ہے اب رسنا ہر وقت گنگناتی رہتی اس پر غشی کے دورے بھی نہیں پڑتے تھے کئی کئی دن وہ مندر بھی نہیں جاتی تھی۔

تین ماہ ڈاکٹر رشر انگلینڈ چلا گیا اس کے جانے کے چھ ماہ بعد رسنا کے ہاں بچّہ ہوُا۔ کروڑ پتی خاندان کا وارث پیدا ہوگیا۔ دادا کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دان پُن کرنے کے لئے اس نے اپنی تھیلیوں کے منہ کھول دئے۔

پہلی بار جب مگن لال نے اپنے بچے کو دیکھا تو دیر تک خاموشی سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ رسنا نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اس کا چہرہ ایک مکمل نقاب تھا۔ ڈاکٹر اور دو نرسیں قریب کھڑی

تھیں اور وہ بھی اسی کمرے میں ایک طرف کھڑے اسے غور سے دیکھ رہے تھے بچّہ بہت خوبصورت تھا۔ گلابی گلابی پھولے پھولے گال اور ان کے اوپر نیلی نیلی آنکھیں اور شفاف دودھیا ننھے ننھے پاؤں وہ پالنے میں پڑا خوشی سے ہمک رہا تھا۔

مگن نے جھک کر بچے کو گہری سنجیدگی سے اپنی باہوں میں اُٹھایا اُٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کے ماتھے پر ایسے بوسہ دیا جیسے وہ ایک صلیب کو بوسہ دے رہا ہو۔ پھر اُس نے بڑی احتیاط سے بچے کو پالنے میں واپس رکھ دیا اور چپ چاپ کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے سال ڈاکٹر رشر پھر علاج کے لئے آیا۔ آیا تو دو ماہ کے لئے مگر رسنا نے اصرار کر کے مزید دو تین ماہ کے لئے روک لیا۔ اس کے جانے کے سات ماہ بعد پھر ایک لڑکا ہوا پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور تندرست، دوسرے بچے کی زچگی سے فارغ ہو کر رسنا بھی تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے سوئٹزر لینڈ چلی گئی اپنے دونوں بچوں کو لے کر۔ اس کا ارادہ چند ماہ کے لئے یورپ میں سیاحت کرنے کا تھا۔ کروڑپتی سیٹھ نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس قیام کے دوران میں ڈاکٹر رشر پورے وقت رسنا کے ساتھ رہے گا اور ہر دم اس کی صحت کا خیال رکھے گا۔

جب رسنا یورپ چلی گئی تو اس کے چند روز بعد ایک رات مگن لال اپنے باپ کی خواب گاہ میں گیا اور اس سے کہا۔ اب جبکہ آپ کے

خاندان کے دو وارث پیدا ہو گئے ہیں بلکہ ممکن ہے تیسرا بھی ہو جائے
میں یہاں سے جانا چاہوں گا۔"

"جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ میں نے آج تک تمہاری کونسی خواہش پوری نہیں کی ہے" سیٹھ چمن لال نے اس سے کہا۔ میں تو چاہتا تھا کہ یورپ کے سفر پر تم بھی رسنا کے ساتھ چلتے مگر تم نے خود ہی انکار کر دیا اب کہاں جانا چاہتے ہو؟"

آپ سمجھتے نہیں ہیں۔" مگن لال نے اپنے باپ سے کہا" میں نے یہ گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"کسی دوسرے گھر میں رہنا چاہتے ہو؟"

"نہیں مجھے . . . !" مگن رک رک کر کہنے لگا۔ میں دراصل یہ گھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا چاہتا ہوں میں آپ سے ایک پیسہ بھی نہیں لینا چاہتا۔ صرف چند چیزیں یہاں سے لے جاؤں گا اور پھر کبھی آپ کو اپنی صورت نہیں دکھاؤں گا۔

"مگر کیوں؟"

"وجہ آپ جانتے ہیں؟"

سیٹھ چمن لال دیر تک چپ چاپ رہا پھر کسی قدر سخت لہجے میں بولا "احمق مت بنو! تم بھی اگر میری جگہ ہوتے تو یہی کرتے۔ جانتے ہو ہمارا

خاندان ہندوستان کے پہلے تیس خاندانوں میں سے ہے دولت اور طاقت کے اعتبار سے یہی تیس خاندان ہندوستان پر حکومت کرتے

ہیں ۔وزیروں کے نام اور عہدے بیلے شک بدلتے رہتے ہیں مگر در اصل حکومت ہماری ہے۔تم کیا جانتے ہو۔کیا میں اس طاقت اور دولت کو لاولد چھوڑ دیتا؟ اور اپنے دشمن کے ہاتھوں میں جانے دیتا۔؟"

" وہ بچے میرے نہیں ہیں اور اب وہ بیوی میری بیوی نہیں ہے"

اسی طرح یہ دولت جو ہم نے گذشتہ سو سال میں اکٹھی کی ہے در اصل ہماری نہیں ہے اخلاق کے ایسے کھوکھلے اصول اسٹیج پر اور مذہبی کتابوں میں بڑے اعلا معلوم ہوتے ہیں مگر زندگی میں ان کا کیا کام؟ تمہارے آباو اجداد اگر ان اصولوں پر چلتے تو آج ہم دونوں فٹ پاتھ پر ہوتے۔ احمق مت بنو"

مگن لال نے بڑے غصے سے شانے اُچکائے ۔اس کے باپ نے مگن لال کو شانے سے پکڑ کر قریب کی ایک کرسی پر بٹھا دیا۔وہ خود پلنگ پر بیٹھا تھا۔کرسی اور پلنگ کے بیچ میں ایک چھوٹی تپائی تھی جس پر اس کے دونوں خوبصورت پوتوں کی تصویریں کیبنٹ سائز کے فریم میں جڑی رکھی تھیں۔سیٹھ چمن لال کا ہاتھ دیر تک ان دونوں بچوں کے فریم سے۔ کھیلتا رہا۔ اس کی بے چین انگلیاں کبھی ایک فریم پر جاتیں کبھی دوسرے فریم پر آخر اُس نے نگاہ اٹھا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور تصویروں کی طرف اشارہ کیا اور تیز نشتر کے انداز میں بولا۔ایک دن میں بھی اسی طرح پیدا ہوا تھا۔

مگن لال نے وہ دنیا چھوڑ دی تھی۔ اور اب اکیلا شہر کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ آتے وقت اس نے اپنے ساتھ کچھ نہیں لیا تھا صرف چاندی کا وہ چھوٹا سا فریم جس میں میں بند تھا اٹھا کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اس کی جیب میں صرف چند آنے تھے اور وہ اسی طرح گھر سے نکل آیا تھا۔ چوروں کی طرح باپ کو بتائے بغیر کوئی چٹھی چھوڑے بغیر مگر اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اُس گھر میں کبھی واپس نہیں جائے گا وہ کیسے اپنی زندگی بسر کرے گا؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ کیا کام کر سکتا ہے؟ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ دراصل آج تک جس دن سے وہ پیدا ہوا اس نے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کا سارا جسم آج تک مکمل بیکار رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں دل و دماغ رگیں، ریشے، نسیں پٹھے سب بے کار تھے۔ زندگی بھر چاندی کے چمچے سے دودھ پلایا گیا تھا بے بہار کے انگوری داتوں کی طرح اسے نرم روئی اور ریشم اور سنجاب میں لپیٹ کر رکھا گیا۔ اسے اپنا جسم ٹھیک سے استعمال کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا کچھ بھی وہ کبھی واپس نہیں جائے گا دیر تک وہ سڑکوں پر ادھر اُدھر گھومتا رہا، وہ بے مقصد آوارہ گھومنا چاہتا تھا۔ وہ چلتے رہنا چاہتا تھا اسے ڈر تھا کہ اگر کہیں وہ رُک گیا تو گھر واپس نہ چلا جائے۔؟

وہ اپنی زندگی میں آج تک کبھی اتنا نہیں چلا تھا محض چند قدم چلا تھا۔ پورچ سے گاڑی تک دکان سے فٹ پاتھ تک فٹ پاتھ سے برآمدے تک بس پیدل چلنے کے یہی چند قدم اسے یاد تھے اس کے سارے جسم سے پسینہ

بہہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ چلتا گیا۔

رات کے گیارہ بجے تک وہ تھک کر سدانند روڈ کے ناکے پر ایک بارہ منزلہ اونچی مگر نامکمل بلڈنگ کے باہر روڑی اور بجری کے ڈھیر پر سو گیا۔ سامنے سے سمندر کی کھلی خوشگوار ہوا کے جھونکے آرہے تھے وہ کمر سیدھی کر کے پاؤں پھیلاتے ہی سو گیا۔ کب تک سوتا رہا؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا یکایک کسی نے اسے زور سے جھنجوڑ دیا۔ ہڑبڑا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ تیز دھوپ کی روشنی اس کی آنکھوں میں بھالے کی طرح چبھ گئی وہ پلکیں جھپکاتا آنکھیں ملتا جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ایک کسی ہوئی تنومند سیاہ عورت بجری کی ٹوکری اٹھائے اس کے سر پر کھڑی تھی مگر اس نے اس کی ننگی پنڈلیاں نہ صرف دیکھیں بلکہ انہیں دیکھ کر وہ ایک دم چونک گیا شینی کا بُت؟ جلدی سے اس کی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ "اے بابو! اٹھ کب تک سوتا رہے گا۔" اس کے سفید دانت بجلی کی طرح چمکے۔ کیا رات کو دارو جیادہ چڑھا گئے تھے؟ اتنا کہہ کر اس نے ڈھیر سے ٹوکری میں بجری بھری اور ٹوکری اٹھا کے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر بلڈنگ کی طرف چلی گئی وہ دیر تک اس کی لچکتی کمر اور ڈولتی چھاتیوں کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا۔ کیا شینی نے یہی عورت دیکھ کر وہ کالا بُت بنایا تھا۔؟

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اپنے دونوں بازو اس نے ٹانگوں پر باندھ لئے اور گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی ٹکائی اور عورت کو دیکھنے لگا جو اب پھر بجری اٹھانے کے لئے اس کی طرف آرہی تھی۔ وہ بولی۔ "اب گھر جاؤ۔"

"وہ بولا۔ "گھر تو چھوڑ دیا۔"

"تو دھندے پر جاؤ۔"

"میں کوئی دھندا نہیں جانتا"۔ وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"تو اب تک کیسے زندہ تھے؟"

"جندہ بھی تھا کہ نہیں؟ اس میں بھی شبہ ہے۔"

"عجیب آدمی ہے!" سیاہ عورت نے حیرت سے سر ہلایا اس کی ایک جھکتی ہوئی لٹ اُڑ کر رخسار سے نیچے گر کر ہل رہی تھی اس نے جلدی سے اُسے کس کر جوڑے میں باندھ لیا۔ پسینے میں اس کا جسم چمک رہا تھا۔

"مجھے پیاس لگی ہے" مگن لال نے اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی خشک زبان پھیری۔

"وہ ادھر سمنٹ اور بجری مکس کرنے کی جاگہ پانی کا نل ہے جلدی سے جا کے پی لو۔"

پی کے آیا۔ پھر وہیں بجری کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ "تم جاتے کیوں نہیں؟" سیاہ عورت نے پھر ٹوکری میں بجری بھرتے ہوئے کہا۔

"بھوک لگی ہے۔"

"بھوک لگی ہے تو کوئی کام کرو۔! وہ ٹوکری اُٹھا کر پھر چلی گئی۔

جب واپس آئی تو مگن لال نے کہا "مجھے کوئی کام دلوا دو"!

"کیا کام کر سکتے ہو؟"

"جو تم کر سکتی ہو"

"میں تو بجری کی ٹوکری اُٹھاتی ہوں۔"

"میں بھی اٹھاؤں گا۔"

وہ اس کا زرد چہرہ اور اس کا دبلا پتلا جسم دیکھ کر ہنسی۔ کچھ کہا نہیں اس نے ٹوکری اٹھائی اور چلی گئی۔ پھر جو واپس آئی تو سفید مونچھوں والے ایک بوڑھے کو ساتھ لے کر آئی۔ مگن لال کو دیکھ کر سفید مونچھوں والے بڈھے کے چہرے پر ایک تبسّم آیا بولا۔ "اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔"

مگن لال اٹھ کر بجری کے ڈھیر پر کھڑا ہو گیا بڈھے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر بولا۔ "کام کرے گا" ؟

"کرے گا۔"

"ادھر مرد لوگ کو ڈیڑھ روپیہ روج ملتا ہے۔ عورت لوگ کو ایک روپیہ ملتا ہے تمہارا شریر بہت دبلا ہے جسمانی مانک ہے۔" وہ ہنسا تم کو صرف ایک روپیہ روج ملے گا چلے گا؟

"چلے گا۔"

"تو پھر اٹھاؤ ٹوکری اور بجری بھرو۔"

دن بھر وہ بجری بھرتا رہا۔ پہلی بیس پچیس ٹوکریوں میں تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ پھر ہولے ہولے قوٰی شل ہونے لگے ٹوکری بھاری معلوم ہونے لگی جسم سے پسینہ پھوٹ کر بہنے لگا۔ سورج کی کرنیں اس کے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگیں اسے بار بار پیاس لگنے لگی۔ ہاتھ پاؤں بھاری محسوس ہونے لگے جیسے اس کی رگوں میں خون کے بجائے پگھلا ہوا سیسہ بہہ رہا ہو۔ پھر بھی وہ دانت پیس کر دن بھر ٹوکری اٹھاتا رہا

دن میں اُسے دس مرتبہ خیال آیا کہ وہ ٹوکری پھینک کر چلا جائے سڑک سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو آواز دے کر روک لے اور سیدھا اپنے عیش و فراغت کے گہوارے میں واپس چلا جائے مگر وہ دانت بھینچ کر کام کرتا رہا۔ شام کو جب اسے چھٹی ملی تو وہ اس بجری کے ڈھیر پر خالی ٹوکری پھینک کر ہانپتا ہوا لیٹ گیا۔ شام کی سمندری ہوا ہولے ہولے اس کے جسم کا پسینہ خشک کرتی چلی گئی اسے نیند سی آنے لگی۔ اسے اپنے جسم میں انتہائی نقاہت سی محسوس ہونے لگی تھی اسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ کب اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں؟ کب وہ سو گیا؟ ایکا ایکی رات کو کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا کالی عورت اس کے سر پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی اٹھو کھانا کھالو کیا بھوکے ہی سو جاؤ گے؟"

اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا سمندر تاریک ہو چکا تھا بارہ منزلہ نامکمل بلڈنگ ایک خوفناک دیوی کی طرح منہ پھاڑے کھڑی تھی اس کے قدموں میں مزدوروں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں آگ جلائے کھانا کھانے میں مصروف تھیں، آوازیں، گالیاں، ہنسی، عورتوں کی چہکاریں ننگ دھڑنگ بچے آدھی چپاتی ہاتھ میں لیئے جبڑے چلاتے ہوئے۔

ایک موٹی چپاتی پر کالی عورت نے تھوڑا سا ساگ رکھ دیا پہلے تو اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا کیا کرے؟ وہ چھری کانٹوں سے کھانے کا عادی تھا کوئی اور طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر اب اسے بھوک بھی زوروں سے لگ رہی تھی۔ اس نے چپاتی توڑ توڑ کر بڑی سنجیدگی سے ایک سا بیچ نما سینڈوچ بنایا اور اسے بڑی ادا سے کھانے لگا۔ سیاہ عورت مسکرا کر اس کی

طرف دیکھتی رہی۔ کھا کر اس نے کہا "ایک چپاتی اور دو۔"

"نہیں" وہ بولی "آج کل راشن مہنگا ہے۔ پہلے ہم دو چپاتی کھاتے تھے۔ اب ہم سب لوگ ایک ایک چپاتی کھاتے ہیں۔"

"مگر مجھے تو بہت بھوک لگی ہے۔"

"تو نل سے جیادہ پانی پی کر سو جاؤ۔ پر دوسری چپاتی نہیں ملے گی۔"

نل سے پانی پی کر وہ پھر اپنی جگہ لیٹ گیا۔ پر اب اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے وہ دیر تک انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے کروٹ بدل کر اپنے قریب لیٹی ہوئی عورت کو غور سے دیکھا۔ وہ بھی اپنی کھلی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "تمہارا نام کیا ہے؟" مگن لال نے اس سے پوچھا۔

"تکسی۔" وہ بولی

"تمہارا گھر والا کدھر ہے؟"

"میں نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"مارد پیٹیا تھا۔"

"کوئی بال بچہ"؟

"ایک لڑکی تھی نانی مر گئی۔"

وہ دیر تک چپ رہا۔ دیر تک وہ بھی چپ رہی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے رہے اور مگن کا بدن گدگداتے رہے ۔۔۔ سبھی دونوں بازو اپنی چھاتیوں پر باندھے لیٹے تھے اور نیلا ہرا آسمان دیکھنے میں منہمک

تھی۔ پھر اچانک بولی۔ "تمہارا نام؟"

"نگّن۔"

"گھر والی۔؟"

"وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"کوئی بال بچہ؟"

"کوئی نہیں۔"

پھر رات بھر تلسی نہیں بولی۔ نگن بھی تارے گنتے گنتے سو گیا۔
صبح جب اٹھا تو اس کا سارا جسم تپ رہا تھا اور سارا جسم دُکھ رہا تھا۔ پر اُس نے تلسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ٹوکری اُٹھا کے دن بھر کام کرتا رہا۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کام کرتے کرتے اس کا دم نکل جائے گا۔ پھر بھی وہ دانت بھینچ کر کام کرتا رہا۔ شام کو بالکل بے دم ہو کر زمین پر بے سُدھ ہو پڑ گیا۔ رات کو تلسی نے اسے جگایا وہ ہاتھ میں تھالی لیے اس کے سرہانے بیٹھی تھی اور اس کی طرف ہمدردی بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ "تمہیں تو بخار ہے۔"

"یوں ہی سا ہے۔"

"کوئی دوا لو گے؟"

"نہیں کل تک ٹھیک ہو جاؤں گا"

"اُٹھو کھانا کھا لو۔ آج تمہیں دو چپاتیاں ملیں گی۔" تلسی نے تھالی اس کے سامنے رکھ دی۔ "اپنا کھانا اس میں سے اٹھا لیا۔ تم تھالی لے لو۔" تلسی نے اصرار کیا۔

نگن نے تھالی بھر کھانا کھا لیا۔ کھانا کھاتے ہی سو گیا۔ کچھ تو بخار تھا کچھ تھکن، بالکل بے سُدھ ہو کر سو گیا۔ رات کو تلسی دو ایک بار اُٹھی اس نے نگن کو بجری کے ڈھیر پر بالکل بچوں کی طرح سوتے دیکھا۔ گول گنبد کی طرح گھٹنوں میں اپنا منہ چھپائے ہوئے۔ تلسی نے اپنا پرانا بوسیدہ مگر گرم لحاف اس پر ڈال دیا۔ بہت صبح سویرے جب نگن کو پیاس لگی تو اس نے تلسی کا لحاف اپنے جسم پر دیکھا قریب میں تلسی بے خبر سو رہی تھی۔ ستارے ماند پڑ رہے تھے بارہ منزلہ بلڈنگ کے نامکمل دروازوں اور کھڑکیوں کی مستطیلوں سے روشنی چھن کے آ رہی تھی اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا بخار کل سے بھی تیز تھا اور ہتھیلیاں بجری اٹھا اٹھا کر سُوج گئی تھیں۔

آج اسے کام کرتے ہوئے بے حد تکلیف ہوتی رہی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا جسم لکڑی کے جوڑوں سے بنا ہے یا مشین کے زنگ کھائے ہوئے پرزوں سے۔ آج وہ بہت جلد ہانپ جاتا تھا۔ آنکھوں کے آگے ترمرے سے ناچنے لگتے ہیں کبھی کبھی سارا آسمان لال ہو جاتا ہے۔ سر میں چکر آتا ہے۔ تلسی نے اسے کام کرنے سے منع کیا۔ مگر وہ نہ مانا گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح۔ دن بھر ٹوکری ڈھوتا رہا۔ شام تک خود بخود اس کا بخار کم ہو گیا۔ بدن ہلکا ہلکا سا لگنے لگا۔ دوسرے دن بخار اور بھی کم ہو گیا تیسرے دن آپ ہی آپ ٹوٹ گیا۔ کوئی دوا کئے بغیر۔ مگر ہاتھوں کی بُری حالت ہو چکی تھی ٹوکری ڈھوتے ڈھوتے کھال تک اُدھڑنے لگی تھی تیسری رات یہ حالت ہو چکی تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا بھی نہیں کھا سکتا تھا۔

میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں کھلا دوں۔"

"نہیں!" مگن نے سر ہلا کر انکار کر دیا مگر روٹی اٹھا کر جو لقمہ توڑنا چاہا تو اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

"ادھر آؤ" تلسی گرج کر بولی اور اس نے مگن کی تھالی اپنے قریب سرکالی مگن اس کے قریب چلا گیا وہ ایک لقمہ توڑ کر اس کے منہ میں دیتی دوسرا لقمہ توڑ کر اپنے منہ میں رکھتی دونوں جبڑے چلاتے ہوئے مسرور نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تلسی کی آنکھیں تارا جیسی چمک رہی تھیں اور مگن کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے رگ و ریشے میں رچا ہوا برسوں کا زنگ دھیرے دھیرے دھل رہا ہو اس کی روح کے گرد جمی ہوئی برف کا دائرہ ہولے ہولے پگھل رہا ہے۔

کھانا کھلا کے اور تھالی برتن صاف کر کے تلسی نے کہیں سے تیل کی ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور مگن کے ہاتھوں پر دھیرے دھیرے تیل چپڑنے لگی تیل چپڑ کر اس نے اپنی ایک بے حد پرانی اور بوسیدہ ساڑھی نکالی اور اس کی دھجیاں پھاڑ پھاڑ کر اس نے مگن کی ہتھیلیاں باندھ دیں۔

دوسرے دن مگن انہی دھجیوں سے بندھے ہاتھوں سے ٹوکری اٹھا اٹھا کے کام کرتا رہا۔ اگلے چار پانچ دنوں میں اس کے ہاتھوں کے زخم بھر گئے سوجن غائب ہو گئی ہاتھوں میں سخت گھٹے پڑ گئے اب وہ کسی تکلیف کے بغیر اپنے ہاتھوں سے بجری بھر سکتا تھا اس کے جسم کی زردی ہولے ہولے دور ہوتی گئی کھلی دھوپ کھلی ہوا اور رات کی کھلی فضا سے اس کے جسم میں ایک نئی طاقت دوڑنے لگی۔ اگلے پندرہ بیس دن میں وہ اتنا اچھا کام کرنے لگا کہ سفید مونچھوں والے نے اسے ترقی دے کر دوسرا

کے گریڈ میں رکھ دیا۔ اب اسے ڈیڑھ روپیہ روز ملنے لگا۔ وہ تلسی کو دن کے کھانے کے پانچ آنے اور رات کے کھانے کے چھ آنے دیتا تھا۔ وہ آنے کی پائے چیتا تھا کبھی چار آنے کی باقی پیسے وہ تلسی کے پاس ہی رکھ دیتا تھا۔ اس کے جوتے ٹوٹ گئے تھے پتلون پھٹ کر نیکر بن گئی تھی اور گھٹنوں سے ذرا نیچے چیتھڑوں کی طرح لٹک رہی تھی مگر وہ خوش تھا۔

اسی طرح کام کرتے کرتے ایک ماہ اور گزر گیا۔ مگن اپنے بدن میں ایک نئی چیرتی پھرتی اور طاقت محسوس کرنے لگا۔ اس کا سارا بدن توانا ہو گیا تھا۔ باہوں کی مچھلیاں ابھر آئی تھیں اور پاؤں کے تلوے بجری کے پتھروں کی طرح سخت ہو چلے تھے بلڈنگ۔ بھی مکمل ہو چلی تھی چند دنوں میں کام ختم ہو جائے گا پھر انہیں یہ بلڈنگ چھوڑ دینا ہو گی۔ "پھر ہم کیا کریں گے؟" مگن نے کسی قدر پریشان ہو کر تلسی سے پوچھا۔

تلسی بڑی بے پروائی سے بولی "اونہہ! کسی دوسری بلڈنگ پر جا کے ٹوکری ڈھولیں گے۔ بہت بلڈنگیں بن رہی ہیں۔"

اس کے لہجے میں ایسا گہرا اطمینان تھا کہ مگن کو یقین آگیا۔ وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔ ابھی اسے سوتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس کے کان شور غل کی آواز سے چونک گئے وہ آنکھیں کھول کر بیدار ہو گیا۔

ایک آدمی تلسی کو لاتوں ہاتھوں سے گھسیٹ کر پیٹنے کی کوشش کر رہا تھا دونوں میں ہاتھا پائی ہو رہی تھی ایک دم مگن لال گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور ان دونوں کے قریب جا کر بولا۔ "کیا ہے؟"

"تم کو کیا ہے؟" وہ آدمی غرا کر بولا "یہ میری گھر والی ہے اس کو لے جا رہا ہوں۔"

"نہ تو میرا گھر والا ہے نہ میں تیری گھر والی ہوں۔ میں تجھے چھوڑ چکی ہوں
تلسی غصے سے چیخ رہی تھی۔ جیب سے تو نے میری تانی کی جان لی ہے میں
تجھے چھوڑ رہی ہوں۔ آج ڈیڑھ دو سال کے بعد تجھے اپنی گھر والی یاد آئی؟"
"جانے دے، جانے دے!" دوسرا آدمی جو تلسی کے گھر والے سے بھی
لمبا تڑنگا تلسی کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ "اس کو معاف کر دے گھر چل۔"
"نہیں میں اس کے سنگ کبھی نہیں جاؤں گی۔ کبھی اس کے سنگ
نہیں رہوں گی۔" دارو پی پی کر اس نے مجھے بھوکا مار ڈالا میری ساری
کمائی بھی چھین لیتا تھا۔ دارو پی جاتا تھا۔"
"اب نہیں پیئے گا۔" دوسرا آدمی بولا۔
"کیسے نہیں پیئے گا؟ ابھی اس ٹیم تم دونوں دارو پی کے آئے ہو۔"
"چلتی ہے کہ اور مار کھائے گی؟ کھاکھرے نے تلسی کو لات مار کے
کہا۔ مگن لپک کر کھاکھرے کے سامنے آ گیا۔ غضب ناک لہجے میں بولا
"اسے چھوڑ دو۔"
"کیوں چھوڑ دوں؟ کیا تم اس کے یار ہو؟"
مگن نے اس کے منہ پر ایک گھونسا مارا۔ کھاکھرے کے منہ سے
خون نکلنے لگا۔ مگن کو بڑی حیرت ہوئی اسے معلوم نہیں تھا اس کے
گھونسے میں اتنی طاقت ہو گی۔ کھاکھرے گالی بکتا ہوا مگن سے لپٹ
گیا۔ اتنے میں دوسرا آدمی اپنے ہاتھ میں بوتل کی مدد سے مار کر مگن کو نیچے گرا لیا دونوں زمین پر اوپر تلے ہونے
لگے بجری کے ڈھیر سے لڑھکتے ہوئے دور تک نیچے چلے گئے۔

مگن غصے میں دونوں ہاتھ پاؤں چلا کر وار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد کھاکھرے
ہانپنے لگا تو اس کا دوست کھاکھرے کی مدد کو پہنچا دونوں مل کر مگن کا مقابلہ
کرنے لگے مگن بڑی جی داری سے لڑتا گیا۔ مگر وہ دو تھے اور مگن اکیلا تھا
مگن کا پلا ہلکا پڑنے لگا۔ دونوں مل کر اسے پیٹنے لگے تو تلسی میدان میں
آگئی کبھی وہ ایک کو گھونسا مارتی کبھی دوسرے سے گھونسا کھاتی دانت
کٹکٹاتی۔ کبھی پتھر اٹھا کے مارتی۔ مگر دوسرا آدمی کافی تگڑا تھا اس نے
تلسی کو بہت جلد چت کر دیا اور وہ بھی بے دم ہو کر کھاکھرے کے قریب
گر پڑی۔ اب لڑائی مگن اور اس تگڑے آدمی کے بیچ ہو رہی تھی۔
مگن ایک دیوانے کی طرح لڑ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ لڑتے لڑتے
مر جائے گا۔ مگر ہار نہیں ماننے گا۔ اپنے جسم کا آخری زور لگا کے اس
نے اس تگڑے آدمی کو زمین پر گرا دیا اور پھر قریب سے ایک بڑا
سا پتھر اٹھا کے اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔

"اب کے اٹھے تو اس پتھر سے تمہارا سر کچل دوں گا۔" مگن ہانپتے ہانپتے
مگر شدید غصے کے عالم میں بولا۔

تگڑے آدمی نے مگن کے غضب ناک تیور دیکھ کر ہتھیار ڈال دیے
لیٹے لیٹے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر کے بولا۔ "سالا اس ٹیم دارو پیا ہے
لڑ نہیں سکتا۔ صبح کا ٹیم ہوتا تو تم کو دکھاتا۔ اس ٹیم ماپھی دو۔"

اتنے میں بہت سے مزدور، مرد، عورتیں اور بچے بھی جمع ہو گئے
تھے کھاکھرے اپنے دوست کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ مگن نے پتھر

اپنے ہاتھوں سے نیچے زمین پر پھینک دیا۔

اس رات سفید مونچھوں والے بڈھے نے تلسی اور مگن کو صلاح دی کہ وہ دونوں باہر نہ سوئیں نہ بجری پر بلکہ بلڈنگ کے اندر گراؤنڈ فلور کے کسی کمرے میں جا کے سو جائیں ۔کیا معلوم یہ لوگ پھر بد معاشی کریں اور دوسرے غنڈوں کو لے کر آئیں ۔

ایک کمرے کے اندھیرے فرش پر دونوں لیٹے تھے چپ چاپ سمندر کی ناتمام گرج مگن کو اپنے دل کی دھڑکن کی بازگشت معلوم ہوتی تھی۔

" مگنے !" تلسی بڑے کمزور لہجے میں بولی ۔

" ہاں ۔"

" تو میرے لئے کیوں لڑا ؟"

" ایسے ہی ۔"

" بہت چوٹ کھائی ہے !"

" نہیں تو ۔"

" کہاں کہاں چوٹ لگی ۔ مجھے بتا دو !"

" کہہ جو رہا ہوں ، کہیں چوٹ نہیں لگی ۔"

" میں پوچھتی ہوں مگنے ! تم میرے لئے کیوں لڑے ؟"

مگن چپ رہا۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ تلسی کا ہاتھ اس کا جسم دھیرے دھیرے ٹٹول رہا ہے ہوا کی سرگوشی سے بھی زیادہ کمزور آواز میں وہ بولی ۔

" کیا یہاں چوٹ لگی ہے ؟ . . . " " کیا یہاں چوٹ لگی ہے ؟ . . . "

تلسی کی نرم نرم انگلیاں مگن کا جسم چھونے لگیں۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیا ہو رہا ہے ؛ مگن اپنے آپ سے پوچھنے لگا۔ میرا جسم کیوں گرم ہو رہا ہے۔ زمین سے بخارات اُٹھ رہے ہیں۔ سمندر کا شور اچانک بڑھ گیا ہے دیواریں سانس لے رہی ہیں۔ کسی مسرت آمیز خوشی میں کانپ رہی ہیں مگن کو اپنے ہاتھوں سے چنگاریاں سی اڑتی محسوس ہونے لگیں رگوں میں خون کودنے لگا۔ آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے۔ اس نے بڑی تیزی سے تلسی کو اپنی دونوں باہوں سے گھسیٹ کر اپنے سینے پر گرا لیا اور جذبات سے گلوگیر آواز میں آتشیں لہجے میں بولا "آ تجھے بتاؤں مجھے کہاں چوٹ لگی ہے۔"

اب وہ اس بلڈنگ سے بہت دُور شہر کے دوسرے حصے سے گزر رہے تھے۔ کام کی تلاش میں ۔ ۔ ۔ مگن نے تلسی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور وہ دونوں خوش خوش نئے شادی شدہ جوڑے کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے ایک بہت بڑی محل نما عمارت دیکھ کر تلسی ٹھٹھک کر رک گئی حیرت سے دیکھنے لگی "کسی راجہ کا محل معلوم ہوتا ہے۔"

مگن اپنے گھر کی عالی شان عمارت دیکھ کر زور سے ہنسا۔ بولا "ہاں مگر اس محل میں سب نامرد رہتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ تلسی کو گھسیٹ کر آگے لے گیا۔ محل پیچھے رہ گیا۔ نظروں سے دُور ہو گیا ہمیشہ کے لئے۔